# Sheher e dil ki galion main

by kcs

صائمہ شاہد

# شہر دل کی گلیوں میں

میرا دل بہت اداس تھا۔ میں یوں ہی سڑک پر نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کی یخ بستہ رات میں سرد چاند بھی بادلوں کے حلقے میں میرے ساتھ ہولیا۔ کچھ دیر میں یوں ہی چلتا رہا۔ کچھ لمحوں بعد چاند نے نہ جانے کس سے شرما کے بادلوں میں اپنا منہ چھپایا تھا۔ اک چاند کا میں بھی تمنائی تھا۔۔۔ لیکن وہ نفرت کے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ کاش! کوئی میرا بھی تمنائی ہوتا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا۔ جیسے چاند کے ساتھ چاندنی۔۔۔

ناولٹ

ادھر چاند چھپا، ادھر چاندنی بھی اوجھل ہوئی۔ تنہائی کا احساس پوری شدت سے جاگا تھا۔ لبوں نے بے اختیار ابن انشاء کی نظم گنگنائی۔

شہر دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی۔۔۔ بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے۔۔۔ روح و جاں میں بستی ہے
شہر دل کی گلیوں میں۔۔۔ سرد سرد راتوں کو
زرد چاند بخشے گا۔۔۔ بے حساب تنہائی
بے حجاب تنہائی
شہر دل کی گلیوں میں

پتا نہیں میں کس سمت جا رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کس طرف جانا چاہیے تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا کرنا چاہیے تھا۔

مجھے نہیں خبر میرا جینا کیا؟ میرا مرنا کیا؟ میرا ہونا کیا؟ میرا نہ ہونا کیا؟

اگر اس سے دس گنا دولت بھی میرے پاس آجائے تو بھی کیا ہوگا؟ میرے اپنے تو میرے پاس نہیں آسکتے۔ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، لیکن نہ تو سچی خوشی خریدی جاسکتی ہے اور نہ ہی خالص محبت۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنی ساری دولت، ساری نیک نامی وار کر ان خواب سی آنکھوں میں سارے جہاں کی خوشیاں اور اپنے لیے ڈھیر ساری محبت بھر دیتا۔ مگر نہیں ان آنکھوں میں میرے لیے صرف نفرت تھی۔ بے انتہا




www.paksociety.com
Downloaded From paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

نفرت۔۔۔ پتا نہیں اسے میری کم صورتی سے نفرت تھی یا پھر میرے نامکمل وجود سے۔۔۔؟ میں نے اپنی ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھا، وہ میری ہتھیلی کی لکیروں کا عکس تو تھی، مگر مقدر نہ تھی۔ "کاش وہ میرا مقدر ہوتی۔"

اچانک دو سبز آنکھیں میرے خیالوں میں مخل ہوئیں۔ پتا نہیں ان آنکھوں میں ایسا کیا تھا جو مجھے اپنی جانب کھینچتا۔ کچھ کہتی ہوئی، کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوئی پاگل آنکھیں۔ ان آنکھوں میں میرے لیے نفرت نہیں تھی۔ نہ ہی ہمدردی اور ترحم تھا۔ شاید۔۔۔ شاید میرے لیے پسندیدگی تھی۔ اور میں اپنے ہی خیال پہ ہنس دیا۔ یہ پسندیدگی بھی ہمدردی کی ہی صورت ہوگی۔

میں یونہی سڑک پہ ٹھوکریں مارتا جا رہا تھا۔ گھرے ہوتے بادل دیکھ کر میں واپس ہولیا۔ جو برسنے کو تیار تھے۔ کھڑکی سے باہر رات بھیگ رہی تھی اور کھڑکی کے اندر میرا من۔



آسٹریلیا میں ٹی ٹوئنٹی کرکٹ میچز ہو رہے تھے۔ سعد خود تو کرکٹ کا دیوانہ تھا ہی، ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ ناچار ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اگرچہ آفس میں کام بہت تھا۔ لیکن سعد کے آگے میری ایک نہیں چلتی تھی۔ ایک لاکھ افراد کی گنجائش کے حامل اس اسٹیڈیم کو آسٹریلیا کا قدیم ترین اسٹیڈیم ہونے کے علاوہ تاریخی و سماجی حیثیت کے باعث آسٹریلیا میں کھیلوں کا ــــ "مرکز" بھی قرار دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں کھیلوں کے شائقین آسٹریلیا آمد پر "میلبورن" کرکٹ گراؤنڈ کی سیر کرنا نہیں بھولتے۔

میں حیرت سے اس شاہکار کو دیکھ رہا تھا۔ "ایم سی جی" کو پاکستانی کرکٹ تاریخ میں بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان نے اپنا آئی۔ آئی سی سی ورلڈ کپ اسی گراؤنڈ پر جیتا تھا۔ اس وقت اسٹیڈیم میں 87 ہزار سے زائد شائقین موجود تھے جو کہ "ایم سی جی" گراؤنڈ میں سب سے زیادہ شائقین کی آمد کے چند ریکارڈ میں شامل ایک ریکارڈ ہے۔

میچ شروع ہو چکا تھا اور خلاف معمول سعد خاموشی سے پاپ کارن کھا رہا تھا۔ ورنہ تو اس کی زبان ایک لمحے کو بھی خاموش ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔

گیمز میں دلچسپی ہونے کے باوجود میں میچز بہت کم دیکھتا تھا۔ میچز نہ دیکھنے کی وجہ وقت کی کمی اور شاید اہم وجہ میرے اندر کا احساس کمتری تھا، جسے میں نے بڑی مشکل سے تھپک تھپک کے سلایا تھا، مگر اس وقت وہ ابھر کر سامنے آجاتا اور اپنے نامکمل ہونے کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا۔ مگر سعد کی ضد کے آگے ہار ماننی پڑی۔ میں پہلی بار کسی میچ کو یوں اسٹیڈیم میں بیٹھ کے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ کرکٹ کا مجھے جنون کی حد تک شوق تھا۔

مجھے تو خواب بھی کرکٹ کے ہی آتے تھے۔ کبھی میں خود کو لندن میں "اوول اور لارڈز" کرکٹ گراؤنڈ تو کبھی "سپر اسپورٹس پارک سینچورین" تو کبھی مانچسٹر کے "اولڈ ٹریفورڈ" میں خود کو بیٹنگ کرتے دیکھتا تو کبھی افریقہ میں "سہارا اوول سینٹ جارج" میں خود کو بالنگ کرواتے دیکھتا۔ کبھی مخالف ٹیم کے مقابلے میں چار رنز کی ضرورت ہوتی اور بال صرف ایک ہوتی اور میں شان دار چوکا لگا کر ٹیم کو جتوا دیتا، تو کبھی آخری بال پہ زبردست چھکا لگا کے کامیابی حاصل کرتا اور مزے کی بات میچ کا اختتام ہمیشہ میرے ہاتھوں چوکے یا چھکے پہ ہی ہوتا۔ اور ناقابل یقین حد تک ہر میچ میں فتح میرا مقدر ہوتی۔ مگر یہ تو خوابوں کی باتیں ہیں۔ خوابوں میں تو ہر ناممکن بات ممکن ہوتی ہے۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ "خواب ہماری ناآسودہ خواہشیں ہوتی ہیں۔"

میں نے اپنے لیے اور خود سے وابستہ لوگوں کے لیے جو خواب دیکھے تھے، وہ تعبیر بن کر میرے سامنے آ ٹھہرے۔ ڈھیر ساری دولت، شہرت، عزت اور ہر طرح کی آسائشیں۔۔۔ گر نہیں تھے تو۔۔۔ میرے اپنے ہی

میرے پاس نہیں تھے۔ آج اگر اماں' ابا ہوتے تو کتنا خوش ہوتے مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر۔۔۔ وہ مجھے مزید ترقی' عمر درازی اور خوشیوں کی دعائیں دیتے۔۔۔ اور اب۔۔۔ اب تو میرے لیے کوئی دعا کرنے والا بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں میں کس کی دعاؤں سے یہاں تک پہنچا تھا۔ پتا نہیں کون مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھے ہوئے تھا۔ میں نے تو خود کبھی بھی اپنے لیے دعا نہیں مانگی تھی۔ کیا خبر وہ میرے لیے دعائیں مانگتی ہو۔۔۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ میرا انتظار کرتی ہو۔ میں اپنی آنکھوں میں نئے خواب سجا رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ ہر خواب پورا نہیں ہوتا' اپنے ہی خیالوں میں مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ میچ کب ختم ہوا۔ حسب معمول پاکستان فائنل ہار چکا تھا اور ہم منہ لٹکائے واپس اپنے ہوٹل آگئے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ہم ہوٹل راماوان میں تھے۔ ہم مزید دو دن آسٹریلیا میں رک گئے تھے۔ سارا دن ہم نے ہاربر برج' ڈارلنگ ہاربر' سڈنی کرکٹ کلب اور سینٹ میری کیتھی ڈرل کی خاک چھاننے میں گزارا۔۔۔ اور اب رات کے نو بجے۔ "راماوان" کے کمرے میں آتے ہی سعد تو تھک ہار کے سو گیا۔ مگر میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ دراصل میں کیتھی ڈرل میری سینٹ کی پراسرار پتھریلی عمارت کو تنہائی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد بائیں جانب ڈارلنگ ہاربر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ ہے۔ میں نے یوں ہی فٹ پاتھ پہ پیدل چلنا شروع کر دیا اور چلتا ہی چلا گیا۔

"سنٹرڈے نائٹ" تھی۔ اسی لیے خوشبوؤں سے اٹی ہوئی اور رنگوں سے سجی ہوئی تھی۔ صاف و شفاف چمکتی دمکتی سڑکوں پہ نوجوان اور نوخیز جوڑوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ کچھ شوقین مزاج بوڑھے بھی اس یخ بستہ اور رنگین رات سے لطف اندوز ہونے کے لیے گھروں سے نکل آئے تھے۔ چمکتے دمکتے حسین چہرے۔۔۔ آنکھیں خوشی سے چھلک رہی تھیں۔ اک اک ادا میں سرمستی' شوخی بسی ہوئی۔

سینٹ میری کیتھیڈرل اور بوٹنیکل گارڈنز کہیں پیچھے ہی رہ گئے تھے۔ اور میں اپنے ہی خیالوں میں اتنا راستہ پیدل طے کر چکا تھا۔ ٹیکسی کا ملنا اس وقت محال تھا اور بس سروس بھی رات کے اس پہر بند ہو چکی تھی۔ بادل نخواستہ واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ کچھ آگے جا کے ٹیکسی مل گئی۔

غور سے دیکھنے پر ڈرائیور ذرا معقول آدمی لگا۔ دیکھنے میں تو ایشیائی لگتا تھا۔ کچھ دیر وہ بیک مرر سے مجھے گھورتا رہا۔

"آپ ایشیائی لگتے ہیں؟" آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔

"جی۔۔۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں سے ہیں؟"

"پاکستان سے۔" میرے جواب سے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی لہر ابھری۔

"آپ انس علی خان ہیں نا!" وہ آنکھوں میں یقین لیے پوچھ رہا تھا اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔

کیا یہ کوئی جن زادہ ہے؟ یا دلوں کی باتیں جاننے والا میرے دل میں ایک لمحے کو خوف کی لہر اٹھی۔

"آپ وہی انس علی خان ہیں نا! جنہوں نے "دیار غیر" ناول لکھا تھا؟" او تو یہ معمہ اب حل ہوا۔

"جی میں وہی انس علی خان ہوں۔" مجھے حیرت ہوئی کہ میں اتنا مشہور رائٹر تو نہ تھا کہ ہر راہ چلتا مجھے پہچان لیتا۔ میں کبھی کبھار ہی لکھتا تھا۔ میں نے لکھنے کو پیشہ نہیں بنایا تھا۔ بس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے لکھتا تھا۔ یہ واحد کام تھا جو میں اپنی خوشی اور دلی آمادگی کے ساتھ کرتا تھا۔ میرا صرف ایک ناول اور ایک افسانوں کا مجموعہ آیا تھا یا پھر ایک انٹرنیشنل میگزین میں آرٹیکلز لکھا تھا۔

"میں نے آپ کا ناول پڑھا ہے۔ میرے جیسے

ہزاروں نوجوانوں کی کہانی ہے یہ۔۔۔ جو میری ہی طرح اپنے ملک کو' اپنے لوگوں کو چھوڑ کے دور دریس میں روزی کے چکروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"آپ کے ناول کے کردار "سلینہ" کی طرح میری "سلینہ" بھی میرا انتظار کرتے کرتے پیا دیس سدھار گئی اور میں۔۔۔" اس نوجوان کی گہری سیاہ آنکھیں نم ہو گئیں۔

"وہ یہی سمجھتی رہی کہ میں شاید بہانے کر رہا ہوں واپس نہ لوٹنے کے' مگر وہ پگلی کیا جانے' یہاں سے رہائی آسانی سے نہیں ملتی۔۔۔ اور میری ماں۔۔۔ میری ماں ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کے چلی گئی۔۔۔

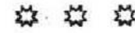
اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔"

"دیکھو جوان!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "جو تم کر سکتے تھے اپنوں کے لیے وہ تم نے کیا' باقی اللہ کو دائمی جدائی منظور تھی تمہارے اپنوں سے' تو کیا کیا جا سکتا تھا؟ اگر تم پاکستان میں ہوتے خالی ہاتھ' بے روزگار تب بھی تمہاری ماں کو بچھڑنا ہی تھا' تب تمہیں زیادہ پچھتاوا ہوتا کہ تم ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ تم خالی ہاتھ ہوتے تو کیا تب بھی "سلینہ" تمہاری ہو جاتی؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ مرتے دم تک میرا انتظار کرتی' مگر زمانے کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔" وہ اک دم تڑپ سا گیا۔ محبت کرنے والے یوں ہی خوش گمان ہوا کرتے ہیں۔

راماوان آچکا تھا' میں نے میٹر دیکھ کر کرایہ دیا۔ اگلے

روز نو بجے ہماری واپسی کی فلائٹ تھی۔



پھر سے وہی روٹین۔۔۔ آفس ورک۔۔۔ گھر اور تنہائی۔ میں نے اپنا کیا ہوا کام (محفوظ) کیا اور لیپ ٹاپ آف کر دیا۔ جانے کیوں میں آج کچھ بے چین سا تھا۔ کام کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے گلاس وال سے باہر دیکھا تو برف پڑ رہی تھی۔ اوسلو کے باشندے شدید برف باری سے بے نیاز اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ یہاں کے لوگ دیگر برفانی علاقوں کے باشندوں کی طرح سرخ و سفید اور اونچے لمبے ہوتے ہیں۔ ان کی ــــــ آنکھوں میں سمندر کی نیلاہٹ ہے۔ جبکہ بالوں کا رنگ اخروٹی' براؤن اور سفید ہوتا ہے۔

میری آنکھوں میں چھم سے دو سبز کانچ سے کٹارا نین اتر آئے۔

اور میں نیلے لوہے کے گیٹ والے کچے پکے آنگن میں پہنچ گیا' جس کا آدھا اگلا حصہ پختہ تھا' جبکہ پچھلا حصہ قدرے نیچا اور کچا تھا۔ اس کچے حصے میں لگا "نیم" کا درخت اور درخت کی ایک موٹی اور مضبوط شاخ میں پڑا جھولا اور جھولے پر بیٹھی وہ جھیل سی سبز آنکھوں والی ننھی سی پری کچھ فاصلے پر ہانڈی چولہے پر چڑھائے ساگ پکاتی پھپھو۔۔۔ اور اک طرف ساگ کے تڑکے کے لیے پیاز کاٹتی بھابھی جان۔۔۔ مجھے وہ آنگن' اس میں بسنے والے لوگ' وہاں گزرے سب ہی اچھے' برے مناظر بے طرح یاد آئے۔



وہ جون کی کوئی تپتی دوپہر تھی جب میں چچا کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ چچا کے گھر میں میرے جیسے لنگڑے اور یتیم کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چچا تو مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر کیا کرتے؟ چچی سے بہت ڈرتے بھی تو تھے اور ان ہی کے روز' روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کے مجھے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔ پھپھو نے گلے لگا کے مجھے ڈھیر سا پیار کیا۔ اپنے بھائی کو یاد



کر کے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا فیروزی شلوار قمیص میں اپنے اخروٹی بالوں کو بمشکل پونی میں قید کیے وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر چچا کو دیکھنے پر آنکھوں میں شناسائی کی لہر ابھری۔

"ماموں ابا۔۔۔" پرجوش انداز میں بھاگتی ہوئی چچا کی گود میں زبردستی گھس گئی۔

"میری دمی کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ ماموں ابا۔۔۔ ماموں ابا! میرے لیے کیریاں لائے ہیں؟"

"ہاں ہاں لایا ہوں۔ میں اپنی دمی رانی کی فرمائش کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"کہاں ہیں کیریاں؟" اس کی سبز آنکھیں چمک اٹھیں۔

"عمنا۔۔۔" پھوپھو کے تنبیہی لہجے پر وہ جھجک گئی۔ "چاچو کو سلام کرو۔"

"چاچو۔۔۔ کون چاچو۔۔۔؟" اس کی آنکھوں میں چاچو کے نام پہ جگنو سے چمک اٹھے۔

"یہ۔۔۔؟" اس نے تفصیل سے میرا جائزہ لیا تو اسے خاصی مایوسی ہوئی۔ شاید میرا ہینڈ و حلیہ اس کے مروجہ چاچو کے حلیے پر پورا نہیں اتر تا تھا۔

"واؤ، یہ سچ مچ میں چاچو ہے؟" اس نے گویا تصدیق چاہی۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ نقلی چاچو ہے؟" پھپھو اور چچا ہنسے۔

"لوا تا سا (اتنا سا) لڑکا اور چاچو؟" وہ گلابی ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے کھی کھی کرنے لگی۔ اور پھر رک کر بولی۔

"چاچو کوئی ایسے ہوتے ہیں؟"

"اور کیسے ہوتے ہیں؟"

"چاچو تو بابا جیسے بڑے بڑے ہوتے ہیں جیسے۔۔۔ جیسے سامنے والوں کے چاچو نان (ریحان) ہیں۔" اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کے بہت سوچ سمجھ کے جواب دیا۔ اور اس کی باتیں سن کے سب ہنس دیے۔

"پہلے چاچو چھوٹے ہوتے ہیں' پھر بعد میں بڑے ہوتے ہیں جیسے ابھی تم چھوٹی ہو' پھر بڑی ہو جاؤ گی۔" پھپھو نے اسے سمجھایا۔

"آ۔۔۔ آچھا۔ پھر میں مما کو بتا کر آتی ہوں کہ ہمارے گھر چھوٹا سا چاچو آیا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر وہاں سے بھاگ گئی۔

"بہت شرارتی ہے میری پوتی' اکثر اکلوتے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس لیے بھی بہت ضدی ہو گئی ہے' جانتی ہے نا کہ ہر فرمائش پوری ہو گی۔ اریج اور احد بھی اسی کی عمر کے ہو کے اس دنیا سے گئے تھے۔ اب اس کی بہت فکر رہتی ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔" پھپھو افسردہ ہوئیں۔

"بس آپ پریشان نہ ہوا کریں' اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔" "اللہ" "اسے ضرور صحت مند زندگی دے گا' ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ۔۔۔" پھپھو نے بھی دل کی گہرائیوں سے دہرایا۔

کھانا کھا کے شام کی چائے پی گئی' پھر چچا جانے کے لیے پر تولنے لگے۔ جاتے سمے چچا نے میرے ہاتھ پہ سو روپے کا نوٹ رکھا اور گلے لگا کے رو دیے۔ میں بھی افسردہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

میرے یہاں آنے پہ سوائے اظہر بھائی اور پھپھو کے کوئی خوش نہ تھا۔ خصوصاً" پھوپھا جان کا پارہ تو مجھے دیکھتے ہی آسمان کو چھونے لگتا۔

جانے انہیں مجھ سے اتنی نفرت کیوں تھی۔ شاید میں تھا ہی اس قابل کہ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ لوگوں کی نفرتیں برداشت کروں۔ پھر بھی پھپھو میرے لیے مضبوط سہارا تھیں۔ وہ مجھے اپنے مہربان وجود کی پناہ میں لے لیتیں' یوں جیسے سڑک کنارے کھڑا بوڑھا برگد کا درخت کسی تھکے ماندے مسافر کو اپنے سائے میں پناہ دیتا ہے۔

لیکن بہت سی باتیں' بہت سے دکھ میں پھپھو سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس کمرے میں' میں سوتا تھا اس کی کھڑکی پچھواڑے قبرستان میں کھلتی۔ میں کیسے کہتا کہ اس کھڑکی سے مجھے کس قدر خوف محسوس ہوتا ہے۔ سفید کپڑوں میں سائے سے چلتے' پھرتے دکھائی دیتے اور میں سہم سہم جاتا۔

میں کیسے کہتا کہ۔۔۔ کمرے کی بوسیدہ دیواروں کے جگہ جگہ سے اکھڑے رنگ و روغن میں مختلف ڈوبتی ابھرتی شبیہیں مجھے کس قدر ڈراتی ہیں؟ اور خوف میری روح میں سرایت کر جاتا ہے۔ گرمیاں تو جیسے تیسے گزر گئیں۔ بوسیدہ سا پنکھا گھرر گھرر کرتا ہوا دماغ میں ہتھوڑے برساتا، لیکن اوپری منزل پر ہونے کی وجہ سے کھڑکی میں سے ہوا کا گزر رہتا تھا تو میں پنکھا بند کر دیتا۔ کم از کم شور سے تو نجات ملتی۔

لیکن سردیاں۔۔۔ شکستہ کھڑکی کے ٹوٹے پٹ سے آتی ٹھنڈی یخ ہوا ہڈیوں میں اتر کر گودا تک جما دیتی۔ ایسے میں پتلا پرانا لحاف ریت کی دیوار ثابت ہوتا اور پھر یہ خوف کہ کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے۔ پورا وجود سر سمیت لحاف میں گھس جانے پہ مجبور کرتا۔

اور میں روز رات کو سونے سے پہلے سوچتا کہ پھپھو سے کہوں گا کہ مجھے اس بوسیدہ سے پرانے اور آسیب زدہ کمرے میں ڈر لگتا ہے۔ مجھے وہاں بھوت نظر آتے ہیں۔ لیکن پھوپھا کا رد عمل سوچ کر ہمت نہ کر پاتا۔ پہلے دن سے ہی پھوپھا نے مجھے اس کمرے میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ پھوپھو نے بہت واویلا مچایا کہ بچہ اس کاٹھ کباڑ والے کمرے میں رہے گا۔ جہاں چوہے، چھپکلیاں اور الا بلا ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں، مگر پھوپھا کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

"تم پریشان نہ ہونا اک دو دن جیسے تیسے اس کمرے میں گزار لو۔ جب تمہارے پھوپھا کا غصہ ٹھنڈا ہو گا تو میں تمہیں اپنے کمرے میں سلا لیا کروں گی۔" پھوپھو نے میرے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

لیکن پھوپھا کا غصہ کبھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے وہ گرم توے پہ جا بیٹھتے اور پھپھو مجھے ان کے عتاب سے بچانے کے لیے ادھر ادھر چھپا دیتیں۔

☼ ☼ ☼

مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ یہ بات پھوپھا اچھی طرح جانتے تھے۔ جب ہی تو ان کا حقہ گرم کرنے کی اور چھت سے لکڑیاں بلانے کی ذمہ داری میری تھی۔

"چل اوئے! اوپر سے بالن لا اور میرا حقہ تازہ کر (گرم کر) آیا بڑھا پڑھا کو کتابیں پڑھتا ہے۔ ہونہہ۔۔۔ اسکول میں کیا پڑھ کے آتا ہے؟ جو گھر میں بھی کتابیں لے کر ڈرامے کرتا ہے۔ جتنا مرضی پڑھ لے کاکے۔۔۔ رہے گا تو لنگڑا لولا ہی۔ تو نے کون سا بی اے پاس کر کے افسر لگ جانا ہے۔" ان کا غصہ کم ہونے میں ہی نہ آتا۔

"آئے ہائے۔۔۔ کیوں بچے کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ کر دیتا ہے تمہارا حقہ بھی گرم، اتنی باتیں سنانے کی کیا لوڑ ہے؟" پھپھو فوراً میری مدد کو پہنچتیں۔

"تو چپ رہا کر۔۔۔ تیری وجہ سے میں اسے برداشت کرتا ہوں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا؟" پھپھو شیرنی ہی تو بن جاتیں۔

اور میں شرمندہ سا ہو جاتا۔

"ورنہ میرا منہ مت کھلوا۔۔۔ یہ بھی ان ہی لوگوں کا خون ہے جو بہنوں کے حصے کی زمینیں ہڑپ کر جاتے ہیں۔" پھوپھا نے گویا چوٹ کی اور پھپھو تو تڑپ ہی اٹھیں۔

"ارے میں جانتی ہوں تمہارے دل کا بُغض، یہی ہوس تمہیں مارے ڈالتی ہے۔ اسی بات کا دکھ نکالتے تم بچے سے۔۔۔ ارے میرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا قیامت آگئی جو میں نے اپنے حصے کی زمین اپنے غریب بھائیوں کو دے دی۔ اس اک کلے (ایک ایکڑ) زمین سے تو یہاں محل کھڑے ہو جانے تھے، جس کے لالچ میں مرے جا رہے ہو۔" میں زمین میں گڑ جاتا کہ اس سارے جھگڑے کی بنیاد میں ہوں۔

وہ تو اظہر بھائی کے آنے پہ ہی یہ قصہ ختم ہوتا۔ اظہر بھائی کے دروازہ پار کرتے ہی پھوپھا کا لہجہ یک دم بدل جاتا۔

"ارے بھلیے لوکے۔۔۔ میں تو یوں ہی بات کر رہا تھا، وہ تو جیسے تیری مرضی۔۔۔ خواہ مخواہ میں غصے میں آجاتی ہے تو بھی۔" شاید بڑھاپا یوں ہی جوانی کے سامنے ماند پڑ

جاتا ہے۔ بات ادھر ادھر ہو جاتی۔
وہ تو اظہر بھائی خود مجھے اسکول داخل کروا کے آئے تھے ورنہ پھوپھا تو کبھی مجھے اسکول جانے ہی نہ دیتے۔ جتنی دیر اظہر بھائی گھر پہ ہوتے' مجھے پڑھنے کا موقع مل جاتا' ورنہ تو پھوپھا مجھے کسی نہ کسی کام سے دوڑائے ہی رکھتے۔ وہ میرا خیال تو رکھتے تھے' مگر ان کے انداز میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی' میں کبھی بے تکلف ہو کے ان سے بات نہیں کرپایا۔ شاید ان کا مزاج ہی ایسا تھا۔
رہیں بھابھی تو ان کا انداز میرے لیے نیوٹرل تھا۔ مجھے دیکھ کے کبھی ان کے ماتھے پر تیوری چڑھی اور نہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ آئی۔
عینا... عجیب موڈی لڑکی تھی۔ پل میں تولہ' پل میں ماشہ۔ جی میں آتا تو گھنٹوں میرے ساتھ کھیلتی رہتی اور جو میں تھک جاتا تو رو' رو کے آسمان سر پہ اٹھا لیتی اور پھوپھا بجن کی وہ بے حد لاڈلی تھی "جن" کی طرح حاضر ہو جاتے اور آتے ہی مجھے دو چار ہاتھ جڑ دیتے اور مجھے مجبوراً" اس کے ساتھ گھنٹوں کھیلنا پڑتا۔ کبھی چھپن چھپائی' کبھی لڈو۔
اور جو موڈ نہ ہوتا تو پاس سے گزرنے پر بھی پھوپھا سے ٹھکائی یقینی ہو جاتی اور جو کبھی جی میں آتا تو کہانیوں پہ کہانیاں سنانے کی فرمائش جاری رہتی' میں ایک کے بعد ایک کہانی سناتا جاتا' مگر اس کا جی بھرنے میں ہی نہیں آتا۔



یوں روتے ہنستے بہت سے مہینے گزر گئے۔ میں خوب دل لگا کر پڑھتا۔ میں اظہر بھائی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن میری ہی ہوتی۔ سو اس بار تو بورڈ میں ٹاپ کرنے پر اظہر بھائی نے مجھے اسپیشل بچوں والی سائیکل دلا دی تھی۔ جس سے مجھے

بہت آسانی ہو گئی تھی۔ ایک روز اسکول سے واپس گھر آیا تو سناٹے کا راج تھا۔ صرف "کنیزاں بی" تھیں گھر "کنیزاں بی" کہنے کو تو ایک ملازمہ تھیں' مگر گھر کے اک فرد کی حیثیت رکھتی تھیں۔
"کنیزاں بی" سب لوگ کہاں گئے ہیں؟"
"ارے تمہیں نہیں پتا کیا؟ لو میں تو بھول ہی گئی۔ تمہیں کیسے پتا ہو گا؟ تم تو ابھی اسکول سے آئے ہو۔" انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
میرے دل میں تجسس جاگا۔ "بتا بھی دیں اب مجھے کیا نہیں پتا؟"
"عینا کی چھوٹی بہن آئی ہے۔ سب لوگ اسپتال اسے لینے گئے ہیں۔" وہ بہت خوش تھیں۔
"کیا... سچ!" میں بھی خوش ہو گیا۔ شام تک کڑے انتظار کے بعد پھوپھو' عینا اور پھوپھا آگئے' لیکن بھابھی اور بھائی ابھی اسپتال میں ہی تھے۔
"انچھ... انچھ تمہیں پتا ہے؟ ہمارے گھر اک ننھی سی فیری آئی ہے۔ پرستان سے پریاں آئی تھیں اور اسے ہمارے پاس چھوڑ گئیں۔" وہ آتے ہی شروع ہو گئی۔
"تمہیں کیسے پتا کہ پریاں آئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔
"بابا بتا رہے تھے۔ میں نے بابا سے کہا کہ مجھ سے کیوں نہیں ملیں پریاں؟ بابا نے مجھے بتایا ہی نہیں میں نے انہیں دیکھنا تھا؟" وہ اداس ہو گئی اور مجھے ہنسی آگئی۔
"انچھ! کیا پریاں مجھے بھی یوں ہی مما' بابا کے پاس چھوڑ گئی تھیں؟ پھر وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟ کیا میں انہیں یاد نہیں آتی؟" اس کا سوال مجھے مشکل میں ڈال گیا۔
"مجھے کیا پتا' تب کون سا میں یہاں تھا۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔
"اچھا یہ بتاؤ... فیری ہے کیسی؟" میں نے اس کی اداسی دور کرنے کی خاطر پوچھا۔
"بہت پیاری... بالکل میرے جیسی۔" وہ جوش سے بولی اور میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"ہنسے کیوں؟" فوراً" سوال حاضر۔

"ایسے ہی۔"

"اچھا... چلو ہم آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" فرمائش کی گئی۔

"پھوپھو کو پتا چل گیا تو ڈانٹ پڑے گی۔" میں نے ٹالنا چاہا۔

"تمہیں پتا چلے گا جب ہی ڈانٹیں گی نا! ہم چپکے سے نکل جائیں گے۔ بابا سے پیسے لے لیے تھے میں نے۔" وہ جو کرنے کی ٹھان لیتی' وہ پورا کر کے چھوڑتی' انکار کرتا تو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا قیامت آتی سو ساتھ دیتے ہی بنی۔

آج تو وہ بہت خوش تھی۔ جب ہی تو اپنے لیے آئس کریم لیتے ہوئے ایک کپ میرے لیے بھی لے لیا تھا۔ ورنہ ایسی فیاضی کی توقع نہیں تھی اس سے۔ وہ لینے والوں میں سے تھی۔ دینے والوں میں سے نہیں

اسٹور کے باہر پڑے بینچ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"ایک بات کہوں؟" اس کا خوش گوار موڈ دیکھ کر میں نے کہا۔

"ہاں کہو" اس کے انداز میں شان بے نیازی تھی۔

"تم مجھے "انچھ" نہ کہا کرو۔"

"تو اور کیا کہوں؟"

"انس کہا کرو۔ تمہاری وجہ سے محلے کے سارے بچے مجھے انچھ... مگر مچھ کہہ کر چھیڑتے ہیں۔"

"اوہو گندی بات ہے نا؟ کسی کا الٹا نام لینا۔ اگر دوبارہ کسی نے کہا تو مجھے بتانا۔"

☼ ☼ ☼

ننھی پری گھر آئی تھی' وہ واقعی پری تھی۔ سبز جھیل سی آنکھیں اس پر لانبی پلکیں' گلابی ہونٹ' دودھ کی سی سفید رنگت' بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی' سارا دن سوتی رہتی یا پھر روتی رہتی۔ نام کے مسئلے نے سر اٹھایا تو ہر کسی کی الگ رائے تھی۔

"بھئی میں نے تو گڑیا کا نام سوچ لیا ہے۔ کوئی جو بھی کہے میں یہی نام رکھوں گی۔" پھوپھو نے اعلان کیا۔

"تم تو رہنے ہی دو۔ رکھ دو گی اپنے دور کی کسی فلمی ہیروئن یا پھر کسی مصنفہ کا نام۔" پھوپھا کیونکر چپ رہتے۔

عینا کا نام بھی پھوپھو نے رکھا تھا۔ پھوپھو "قرۃ العین حیدر" سے بہت متاثر تھیں' سو اٹھا کے رکھ دیا اپنی پوتی کا نام۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی جو بھی کہے میں تو "نور الھدیٰ" رکھوں گی گڑیا کا نام۔"

"اف دادو... اتنا مشکل نام مجھ سے تو کہا ہی نہیں جائے گا۔"

"آجائے گا کہنا بھی... پہلے پہل مشکل ہوتی ہے' پھر ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں تو بس اسے فیری ہی کہوں گی۔" یہ عینا کا فیصلہ تھا۔ پھر گھر میں سب "عینا" کی دیکھا دیکھی گڑیا کو فیری ہی پکارنے لگے۔

عینا پہلے پہل فیری کے آنے سے بہت خوش تھی' مگر پھر آہستہ آہستہ اس سے ——— جلنے لگی' کیونکہ عینا کو محبتوں میں اس کی شراکت ہرگز گوارا نہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

وقت کے ساتھ ساتھ عینا کی مجھ سے نفرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ شروع میں تو میں اسے موڈی سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔ مگر وہ مجھے اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ نہ صرف مجھے' بلکہ فیری کو بھی چھپ چھپا کے دو لگا ہی دیتی۔ اس کا غصہ فیری پہ نکلتا یا پھر مجھ پہ۔ صرف وہی نہیں بلکہ مجھ سے نفرت کرنے والے دو اور کرداروں میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور وہ تھے پھوپھا کے داماد فیاض خان اور ان کا بیٹا داؤد فیاض۔

فیاض خان اپنی فیملی کے ساتھ فرانس میں مقیم تھے۔ چھٹیوں میں ان کا پاکستان کا چکر ضرور لگتا۔ اب کے عینا اپنی اکلوتی پھوپھو سارہ آپی کے آنے پہ بہت خوش تھی۔ چونکہ وہ خوش تھی اس لیے میں بھی خوش

تھا۔ میں آپی سارہ اور ان کی فیملی سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ سارہ آپی بالکل پھوپھو جیسی تھیں۔ نرم و شفیق... اور ان کے شوہر فیاض خان بالکل پھوپھا جیسے تھے، کرخت مزاج اور ان کا اکلوتا بیٹا داؤد بھی اپنے باپ اور نانا پہ تھا۔

فیاض خان باقی سب کے ساتھ تو بہت نرمی سے پیش آتے مگر مجھے دیکھتے ہی ان کے ماتھے کی تیوری چڑھ جاتی۔ میں ان کے سامنے سہما سہما رہتا اور داؤد... داؤد کی عینا سے گاڑھی چھنتی... دونوں ہم مزاج جو تھے۔ دونوں ہی بہت ذہین تھے۔ تب ہی مجھے تنگ کرنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتے۔

☆ ☆ ☆

"اے لنگڑے! کیا کر رہے ہو؟" میں پچھلے صحن میں نیم کے درخت کے نیچے بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ جب وہ دونوں دبے قدموں وہاں پہنچے۔

"پڑھ رہا ہوں۔" میں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ اب میری کم بختی آجائے گی۔

"ششی... آہستہ بولو۔ پتا نہیں ہے کہ دوپہر کا وقت ہے، سب سو رہے ہیں۔" عینا ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔

"اسے کون سی عقل ہے کہ کب کیسے بات کرنا ہے۔" داؤد نے مذاق اڑایا۔

"چلو ہمارے ساتھ... چاچے شیدے کے باغ سے کیریاں توڑ کے لاتے ہیں۔" عینا نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"لیکن میں پڑھ رہا ہوں۔" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ تپتی دوپہر میں چاچے شیدے کے باغ تک جانے کا سن کر میں جھجک گیا تھا۔

"نہیں جاؤ گے ہمارے ساتھ تو پھر نانا کو شکایت لگا دیں گے کیا سمجھے؟"

"ہاں... ہاں..." عینا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

مجھے مجبوراً ان کے ساتھ جانا پڑا۔ ان شیطانوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ جھوٹ موٹ کی شکایتیں لگا لگا کے مجھے ڈانٹ پڑواتے رہتے تھے۔ انہوں نے چوری چوری بغیر آواز کے سائیکل نکالی۔ خود تو دونوں سائیکل پہ سوار ہو گئے اور مجھے اس گرم دوپہر میں ان کے پیچھے پیدل جانا پڑا۔ چاچا شیدا ظہر کی نماز کے بعد آرام کرنے چلا جاتا تھا۔ اس لیے کیریاں توڑنے کے لیے یہ وقت مناسب تھا۔ میں ہانپتا کانپتا وہاں تک پہنچا۔ دونوں مزے سے چھوٹی نہر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"کتنی دیر سے ہم یہاں بیٹھے ہیں اور تم نواب زادوں کی طرح اتنی دیر میں یہاں پہنچے ہو۔"

"ہاں تو اور کیا... چاچا شیدا آجاتا تو...؟" داؤد کی ہر بات میں ہاں ملانا عینا کا فرض تھا۔

"چلو اب جلدی سے ہمیں کیریاں توڑ کے دو۔" میں نے نیچی نیچی شاخوں سے دو چار کیریاں توڑ کے دیں۔

"اوں ہوں، اک دم فضول... یہ بھی کوئی کیریاں ہیں۔ ذرا بڑی بڑی توڑ کے دو۔" داؤد نے وہ کیریاں پکڑ کے ٹھونک بجا کے دیکھیں اور پھر ناک بھوں چڑھا کے دور پھینک دیں۔

"وہ والی توڑ کے دو۔" عینا کا اشارہ جس جانب تھا، وہ کیریاں میری پہنچ سے دور تھیں۔

"لیکن وہاں تک تو میرا ہاتھ ہی نہیں جائے گا۔"

"تو، یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ تم یوں کرو گدھے بن جاؤ۔ میں تمہاری پیٹھ پہ چڑھ کے کیریاں توڑ لوں گا۔" داؤد کے پاس ہر مشکل کا حل تھا۔

"آہا... داؤد! تم خود کیوں نہیں گدھے بن جاتے؟" عینا پرجوش ہوئی۔

"لیکن مجھے تو گدھا بننا آتا ہی نہیں۔"

"مجھے بھی گدھا بننا نہیں آتا۔" میں نے بھی فوراً جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، میں بتا دیتا ہوں کہ گدھا کیسے بنا جاتا ہے۔" وہ مجھے گدھا بنانے پہ تلا ہوا تھا۔

"میں اپنی بیساکھی سے کیریاں توڑ دیتا ہوں۔"

"یہ بھی ٹھیک... چلو جلدی کرو، کہیں چاچا شیدا نہ

آجائیے۔" عینا نے کہا اور میں نے شکر ادا کیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں ایک ہاتھ سے آم کی ایک شاخ کا سہارا لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں بیساکھی پکڑے کیریاں توڑ رہا تھا۔ جب کرج دار آواز سنائی دی۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو ٹانگیں کپکپا گئیں۔

چاچا شیدا میرے سر پہ کھڑا تھا اور دونوں شیطان غائب تھے۔ چاچے شیدے نے اس وقت تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کے بھگا دیا۔ مگر شام کو پھوپھا سے میری شکایت لگ چکی تھی۔ خدا جانے کہ یہ شکایت چاچے شیدے نے لگائی تھی یا ان شیطانوں نے، لیکن پھوپھا سے مار کھا کے میرا جسم نیلو نیل ہو گیا۔ پھوپھو نے بہت مشکل سے مجھے ان کے ہاتھوں سے چھڑایا اور میں تنہائی میں اپنے زخموں پہ مرہم رکھتے ہوئے رو دیا۔

☼ ☼ ☼

داؤد کے جانے سے جہاں عینا اداس ہو گئی تھی۔ وہیں میں نے اس شیطان سے جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کیا۔ بے شک عینا ضدی تھی، مگر اتنی شرارتی بھی نہیں تھی، جتنی وہ داؤد سے مل کر ہو گئی تھی۔ ویسے بھی میں اس کی شرارتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔ لیکن داؤد... خدا کی پناہ... شیطان کا بھائی لگتا تھا وہ۔ گھر میں سکون اور خاموشی تھی۔

دن یوں ہی گزرتے چلے گئے۔ خبر ہی نہ ہوئی کہ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ نفرتیں سہتے سہتے میں نے جوانی اور اس نے لڑکپن سے نوجوانی میں قدم رکھا تھا۔ دل اس کی کج ادائیاں سہتے سہتے جانے کب اس کا بیمار بن بیٹھا، مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ یہ دل کے معاملے بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ متاثر ہونے والے کو خبر ہی نہیں ہوتی۔

وہ بہت بدل گئی تھی اور ان دنوں وہ امور خانہ داری سیکھ رہی تھی اور اس تبدیلی کی وجہ پھوپھو جان تھیں۔ بے شک وہ سب کی لاڈلی تھی۔ مگر پھوپھو جان لاڈ ہی لاڈ میں بچوں، خصوصاً" لڑکیوں کو بگاڑنے کے حق میں نہیں تھیں۔"

اسے سلیقہ شعاری سکھانے میں بذات خود دلچسپی لیتی تھیں۔ پھوپھو کو کد کڑے لگاتی پھوہڑ لڑکیاں سخت ناپسند تھیں۔ عینا کی کم بختی آئی ہوئی تھی۔ وہ اکثر باورچی خانے میں پسینے سے شرابور، حال سے بے حال مختلف پکوان پکاتے ہوئے ملتی۔ پھوپھو اس پہ قیامت کی نظر رکھے ہوئے تھیں۔ ایک ایک جنبش پہ ٹوکتیں اور وہ خوب جھنجلائی ہوئی رہتی اور اس کا غصہ ظاہری بات ہے مجھ پر یا فیری پر نکلتا۔ لیکن اب یہ راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ پھوپھو اس کی بد تمیزیوں کا سختی سے نوٹس لے رہی تھیں۔ نتیجتاً" غریب برتن نشانہ بنتے۔ روز کچن میں کچھ نہ کچھ ٹوٹتا۔

اس دن شدید گرمی تھی۔ میں کالج سے واپس آیا تھا گھومتے ہوئے دماغ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو قہقہوں کی برسات نے استقبال کیا۔ تیز دھوپ سے کمرے میں داخل ہونے کے بعد میری آنکھیں چند لمحوں کو تو کچھ دیکھ ہی نہیں پائیں۔ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو عینا کو اپنی طرف ناگواری سے دیکھتے پایا۔ قہقہوں کو بریک لگ چکی تھی۔ یہ "عینا" کی سہیلیوں کا گروہ تھا۔ میں ان ہی قدموں واپس ہو لیا۔

"یہ کون ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"ہمارا سرونٹ ہے۔" نخوت سے جواب دیا گیا۔

"چچ چچ چچ... بے چارہ... اس کی ٹانگ کو کیا ہوا؟" سوال کیا گیا۔

"اسے پولیو ہو گیا تھا بچپن میں۔ میری دادو نے ترس کھا کے اپنے گھر رکھ لیا۔"

میرے قدم جہاں تھے، وہیں تھم گئے۔ دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹا۔ میرے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ شاید اس کی محبت کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ یہ انداز... یہ نخوت و نفرت نئی تو نہ تھی، مگر جانے کیوں دل اس قدر ٹوٹ کے بکھرا تھا۔ یہ نفرتیں تو میری زندگی کا لازمی جز بن گئی تھیں۔ پھر کیوں اس قدر رو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھوپھو کو جانے ایسا کون سا دکھ تھا کہ انہوں نے گھل گھل کے جان ہی دے دی۔ بیمار تو رہتی ہی تھیں، مگر بیماری اتنی شدید بھی نہیں تھی کہ جان ہی لے لیتی۔ مجھے لگا میں ایک بار پھر یتیم ہو گیا ہوں۔ ایک بار پھر سے بے سائباں ہو گیا ہوں۔ میں بلک بلک کے رو دیا۔ میں شاید پھپھو کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے رو رہا تھا۔ اپنے بے اماں ہونے پہ... میں کتنا مفلس ہوں، میرے سارے اپنے مجھ سے ایک ایک کرکے چھنتے جا رہے ہیں۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا، کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔ پھر تقدیر میرے ساتھ اتنا برا کیوں کر رہی تھی؟

میں نے کبھی اللہ سے گلہ نہیں کیا تھا۔ نہ اپنے ادھورے پن کا۔ نہ یتیم ہونے کا۔ نہ ہی لوگوں کی اذیت دیتی نفرتوں کا... مگر اس بار مجھے اپنے اللہ سے گلہ ہوا۔ آخر کیوں؟ کیوں اللہ؟ ہر بار میرے ساتھ ہی کیوں؟

کیوں میرے سارے اپنے مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہیں؟ میں پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ سب رو رہے تھے ایک دوسرے کے آنسو پونچھ رہے تھے مگر میرے آنسو کسی نے نہ پونچھے۔

بہت سے دن یوں ہی اداس اور بے کیف سے گزر گئے۔ میں نے پہلے بھی بہت بار سوچا تھا کہ یہاں سے چلا جاؤں مگر ہر بار محبتیں نفرتوں پہ غالب آ جاتیں، میرا دامن پکڑ لیتیں اور میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتیں۔ یہی محبتیں میرے جسم میں لہو بن کے دوڑتی تھیں۔ یہی محبتیں میرا حوصلہ بن جاتیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں لوگوں کے نفرت اور ذلت بھرے رویے سہ لیتا۔ اور اب جبکہ محبتیں مجھ سے روٹھ گئی تھیں تو میرے پاس یہاں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

"مما! یہ کیوں ہر وقت ہمارے سروں پہ سوار رہتا ہے مجھے جتنی اس انسان سے نفرت ہے یہ اتنا ہی میرے سامنے آتا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے شوٹ کر دیتی۔" میرے خیالوں میں کسی کی آواز گونجی۔

"بس بیٹا میں تو خود تمہاری دادو اور بابا کی وجہ سے چپ تھی ورنہ کب کا اسے چلتا کر دیتی۔" چند روز قبل ماں بیٹی کی گفتگو میرے دل و دماغ میں گونجی اور میرے فیصلے میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اب تو مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے۔

سورات کے تیسرے پہر میں نے ضروری کتابیں اپنے کپڑے اور استعمال کی چند چیزیں سمیٹ کر بیگ میں بھریں۔ اس گھر سے میں نے جو سب سے قیمتی چیز اپنے ساتھ لی تھی، وہ پھپھو، ابا اور اماں کی چند تصویریں تھیں۔

اس گھر کے سوئے مکینوں پہ الوداعی نظر ڈالی۔ تمام یادوں کو سارے خوش گوار و ناخوش گوار لمحوں کو اسی آنگن میں چھوڑا اور خاموشی سے وہاں سے نکل آیا۔ مگر پیدل چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ چچا نے تو پھپھو سے پہلے ہی رخت سفر باندھ لیا تھا۔ ماموں اور ممانی کے دلوں میں تو بہت جگہ تھی مگر ان کے دو کمروں کے کچے مکان اور درجن بھر بچوں کے درمیان شاید میں اپنے لیے جگہ نہ بنا سکوں رہ گئے چھوٹے ماموں تو چھوٹی ممانی اپنے سسرالی رشتہ داروں سے ان کی غربت کی وجہ سے ملنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں، کجا کسی کو اپنے گھر میں مستقل جگہ دینا۔ ویسے بھی میں اب مزید کم ظرف لوگوں کے احسانوں سے اپنے کندھوں پر بوجھ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔

بعض لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کوٹ کوٹ کر محبت بھر دیتا ہے تاکہ وہ ہر کسی میں بلا تفریق پیار بانٹیں اور شاید ایسے ہی مخلص لوگوں کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔ مجھ سے گنے چنے پیار کرنے والوں میں سر عبیداللہ بھی شامل تھے۔ مجھ سے ہی کیا؟ وہ تو بلا امتیاز اور بغیر کسی صلے کے اپنے ہر اسٹوڈنٹ سے یونہی پیار کرتے تھے۔

ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا ناروے میں سیٹلڈ لائف گزار رہا تھا اور چھوٹا بیٹا لندن میں بار ایٹ لاء کر رہا تھا۔ سر عبیداللہ اور ان کی نرم خو شفیق سی بیگم

تنہا رہتے تھے۔ ان کے گھر کے دروازے ہر وقت ہر کسی کے لیے کھلے رہتے۔ لیکن میں اس پہرانہیں بھی تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو رات مسجد میں گزاری اور صبح پہلی سواری سے شہر کا راستہ لیا۔

وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ انہوں نے فوراً" مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ ایسے ہی تھے بے غرض اور مخلص۔

میرے فائنل ایگزامز ہو چکے تھے اور اسی دوران سر عبید اللہ کی ریٹائرمنٹ بھی ہو گئی تھی۔ اور اب وہ اور ان کی بیگم اپنے بڑے بیٹے کے پاس جانے کی تیاری میں تھے۔ میں ان کے جانے کا سن کر اداس ہو گیا۔ مگر انہوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ وہاں جا کے مجھے بھی اپنے پاس بلالیں گے۔ اور تب تک میں ان کے مکان میں ہی رہوں۔ اس طرح وہ بھی بے فکر رہیں گے۔ میں نے اس دوران جاب ڈھونڈلی تھی۔ جب میں انہیں الوداع کر رہا تھا تب تک میرا رزلٹ آچکا تھا۔ اس بار بھی پوزیشن میری ہی تھی۔ سر عبید اللہ نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔

ٹھیک تین ماہ دس دن بعد میں نے ناروے کی سر زمین پہ قدم رکھا۔



میں نے حیرت سے بلند و بالا عمارتوں سے گھرے اس روشنیوں کے شہر کو دیکھا۔ اوسلو کا ساحلی شہر کہر اور دھند میں لپٹا جگمگا رہا تھا۔ سمندر میں ڈوبی روشنیاں دھند کی وجہ سے جگنو بن کر چمک رہی تھیں۔ یہاں کے باشندے سڑکیں عمارتیں نظارے سب اجنبی تھے یہاں تک کہ آسمان بھی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ میں اپنی ہی سوچوں میں جانے کب تک یونہی کھڑا رہتا کہ اچانک مجھے پیچھے سے دھکا لگا۔ اس اچانک افتاد پر میں بوکھلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا' کسی نے میرا اکلوتا بیگ جھپٹا مار کے چھینا اور اندھا دھند بھاگتا ہوا ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا یا کچھ سمجھتا ایک اور لڑکا اس اچکے کے پیچھے بھاگتا ہوا گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ بھی شاید اسی کا ساتھی تھا۔ میں ان کے پیچھے بھاگ بھی نہ سکا اور تہی داماں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

اس بیگ میں تو میرا سب کچھ تھا۔ ابا' اماں کے ساتھ میرے بچپن کی تصویریں جن میں' میں صحت مند تھا۔ اماں کا کانپتا ہوا بے فکر چہرہ' ابا کی بے ریا شفاف ہنسی۔۔ اس بات سے بے خبر کہ آنے والے وقت میں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا جس کے لیے وہ دنیا کی ہر نعمت اور ہر خوشی خرید لینا چاہتے تھے' وہ اپنوں کے پیار اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے بھی ترسے گا۔

میری ڈائری' جس میں 'سر عبید اللہ کا کانٹیکٹ نمبر اور ایڈریس تھا' مجھے یہاں پہنچتے ہی انہیں کال کرنی تھی۔ ان ہی کے سہارے میں اس دور دیس آگیا تھا۔ جہاں کے لوگ' جہاں کے رستے' گلیاں' گھر' زمین آسمان سب کچھ اجنبی تھا۔

میرے پاس تو کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ میں تھک کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا کہ غم کی شدت سے مجھ میں کھڑے رہنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ یہ بھی شکر تھا کہ میرے کاغذات اور کرنسی میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں تھی۔ اسی وقت کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ وہی تھا جسے میں اچکے کا ساتھی سمجھا تھا۔

"لے اڑا میرے دوست" اس نے مایوسی سے کہا۔ "میں بہت بھاگا اس کے پیچھے مگر وہ تو جانے کہاں غائب ہو گیا۔" وہ اس اچکے کا ساتھی نہیں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں بیساکھی دیکھ کر میری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ خاصا باتونی تھا اور اگلے بیس منٹ میں وہ میرا سارا بائیو ڈیٹا مجھ سے اگلوا چکا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں پاکستانی ہوں ——— تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بضد ہو گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں

اس کے ساتھ جانے پہ راضی ہو گیا۔ اور یوں اس دیس میں سر چھپانے کو ٹھکانا مل گیا' اور میں نے تشکر سے آسمان کی جانب دیکھا۔ اس رحمٰن کی رحمانیت پہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ ایک راہ بند ہوئی تو اس نے سو راہیں کھول دیں میرے لیے۔

سعد کا فلیٹ "گرن لان" میں تھا۔ یہاں ہر جانب پاکستانی لوگ رہتے ہیں۔ 'پاکستانی لباس' پاکستانی کھانے' پاکستانی دکانیں' اس لیے تو اس چھوٹا پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ اکثر نارویجن بھی پاکستانی اشیائے خورد و نوش کی دکانوں پر خریداری کرتے نظر آتے۔ پاکستانی کھانے نارویجن قوم میں بہت مقبول تھے خصوصاً" سموسے' پکوڑے۔ کچھ دنوں میں سعد کے توسط سے ایک جنرل اسٹور پہ ملازمت بھی مل گئی۔ میں سعد کا بہت مشکور تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ بولا۔

"میں جانتا ہوں اس سے آگے تو کیا کہے گا' یہی نا کہ سعد! میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ میں ہمیشہ تمہاری خدمت کروں گا وغیرہ وغیرہ ہے نا۔" وہ باقاعدہ' ہاتھ جوڑ کر نقل اتارنے لگا۔

"میں اس وقت تمہارے بور قسم کے ڈائیلاگ سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔" اس کے اپنائیت بھرے انداز پہ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ہاں اگر خدمت ہی کرنی ہے تو چلو میرے پاؤں دباؤ۔" وہ صوفے پہ پاؤں پسار کے بیٹھ گیا۔

"جی نہیں' تمہاری ایسی خدمت میں بالکل نہیں کر سکتا۔" میں نے ہری جھنڈی دکھائی۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم میری خدمت کرو گے۔ خدمت تو خدمت ہی ہوتی ہے چاہے ایسی ہو چاہے ویسی ہو۔"

"مگر میں نے کب کہا کہ میں تمہاری خدمت کروں گا؟"

"لو جی' اتنا بڑا جھوٹ' اللہ جی۔! زمین کیوں نہ دھنس گئی۔ آسمان کیوں نہ گر پڑا اس قدر سفید جھوٹ پہ۔" وہ دہائیاں دینے لگا۔

"اللہ کا خوف کرو۔ زمین کا دھنسنا کوئی عام بات ہے کیا؟ کتنی تباہیاں لاتا ہے اپنے ساتھ یہ زمین کا دھنسا کوئی خیر کے الفاظ بولو۔" میں دہل ہی تو گیا تھا اس کی بات پہ۔

"او میرے استاد جی! غلطی ہو گئی۔ معافی دے دو۔" وہ باقاعدہ کان پکڑ کر بولا۔

"اچھا' چلو جلدی سے اٹھو۔ پیٹ پوجا کرتے ہیں۔ آج میری جاب کی خوشی میں کھانا میری طرف سے۔" پہلے دن سے ہی میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود میرے کھانے کا بل بھی سعد ہی دیتا تھا۔

میں سعد کے جیسا باتونی نہیں تھا' اس لیے اس کے بارے میں زیادہ نہیں جان پایا مگر میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس تنگ و تاریک فلیٹ میں کیوں رہ رہا ہے؟ وہ بھی بیشتر پاکستانیوں کی طرح یہاں روپیہ کمانے ہی آیا ہو گا اور اب اپنی فیملی کے لیے ایک ایک روپیہ سینت سینت کر رکھتا ہو گا۔ مجھے احساس تھا کہ میں اتنے دنوں سے اس پہ بوجھ بنا ہوا ہوں اور وہ بھی اس دیس میں جہاں بے حسی کی انتہا تھی۔ جہاں کوئی اپنا کسی اپنے کا بوجھ برداشت نہیں کرتا۔ جہاں ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑنا پڑتا ہے۔ ہمارے تعلق میں تو پھر صرف ہم وطنی مشترک تھی۔

"ارے یار! آج تو تو نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ جی چاہتا ہے خوشی کے مارے تیرا منہ چوم لوں۔ آج تو اپنی عید ہو گئی۔ چلو آج "چاچے اچھو" کے ریسٹوران کا صفایا کرتے ہیں۔" وہ خوشی کے مارے قلانچیں بھرنے لگا۔ وہ ایسا ہی تھا سادہ دل' بے ریا' مخلص معصوم اور شرارتی۔ بقول کسی کے "پاکستانی جہاں بھی چلے جائیں' اپنی چھوٹی سی دنیا بسا لیتے ہیں' یہاں بھی ہلتی چولوں والے میز کے گرد بوسیدہ کرسیوں پہ بیٹھ کے اپنا پاکستان یاد آ گیا۔

"قیمہ کے ہیٹیز' سری پائے' شاہی حلیم' چانپیں' ہریسہ' تلے ہوئے جھینگے' مغلئی بریانی' آم اور میٹھے میں شیر خورمہ اور انناس کی پڈنگ" سعد نے

جو آرڈر دینا شروع کیا تو چپ ہونا ہی بھول گیا اور بے ساختہ میرا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا۔ جو اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حیرت بھی ہوئی کہ اس چھوٹے سے ریستوران میں یہ سارے کھانے بیک وقت مل جاتے ہیں۔

"تم آرڈر کرو۔" اس نے مینیو کارڈ میری طرف بڑھایا۔

"نہیں میں نے کچھ نہیں منگوانا۔" میری آواز بمشکل حلق سے نکلی۔

"اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میرے ساتھ کھانے میں ہاتھ بٹاؤ گے تو تم غلط سوچ رہے ہو۔ یہ سب تو میں نے اپنے لیے منگوایا ہے۔ اس میں سے تمہیں ایک نوالہ بھی نہیں ملے گا۔"

"تم بھنسے ہو گیا۔ جو سارا کھانا ہڑپ کر جاؤ گے؟ تمہارا معدہ تحمیل نہیں پائے گا اتنا بوجھ۔"

"اٹس مائی اسٹامک ڈیئر! تو اپنی فکر کر۔"

بیرا ابھی تک آرڈر کا منتظر تھا۔ میں نے بند ہوتی دھڑکنوں کو پھر سے ترتیب دیا اور ایک سستی سی ڈش آرڈر کر دی۔ بیرے نے حیران ہو کے پہلے مجھے پھر سعد کو دیکھا۔ اس نے آرڈر نوٹ کیا اور چلا گیا۔

"ابھی تو میں نے اور بھی بہت کچھ منگوانا تھا مگر تمہاری مسکین صورت پہ ترس آ گیا۔" گویا اس نے زیادہ آرڈر نہ کر کے مجھ پہ احسان عظیم کیا ہو۔

میں اس لمحے کو کوس رہا تھا جب میں نے سعد کو کھانے کی آفر کی تھی۔

جیسے جیسے بیرا میز پہ پلیٹیں لا کے چنتا گیا ویسے ویسے میرا حلق خشک ہوتا گیا۔

وہ اطمینان سے کھانا کھا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں ہوٹل والے بل ادا نہ کرنے کی صورت میں میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ کیا پتا مجھ سے برتن دھلوائیں۔ مجھے تو برتن بھی دھونے نہیں آتے۔ کیا خبر مجھ سے جھاڑو لگوائیں پر میں جھاڑو کیسے دے پاؤں گا؟ اور اللہ جانے مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔

پولیس... مجھے اپنی حرکت قلب بند ہوتی محسوس ہوئی۔ اپنے ملک کی پولیس ہوتی تو سو پچاس دے کے جان چھوٹ جاتی مگر سنا ہے یہاں کی پولیس بہت سخت ہے۔

"تم کھا کیوں نہیں رہے؟" اس نے میری توجہ کھانے کی جانب دلائی۔

"بس ایسے ہی۔" میں نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" بھوکا رہنے کا ارادہ ہے کیا؟

اب اسے کیا بتاتا کہ میری بھوک کیوں اڑ گئی ہے۔ وہ کیا سوچتا کہ میں اتنا تنگ دل ہوں لیکن کھلا دل بھی تو ان ہی کا ہوتا ہے، جن کی جیب بھی کھلی ہو۔

اس نے کندھے اچکائے اور دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اس نے اپنی بھوک کے مطابق کھانا کھایا اور باقی کا پیک کروا لیا۔

"میں جا رہا ہوں، مجھے کسی سے ملنا ہے۔" وہ پیک کیا ہوا کھانا ساتھ ہی لے گیا۔ اس کے جانے پہ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے میری درگت بنے۔ میں اپنی ہی سوچوں میں اسے کاؤنٹر تک جاتا دیکھ ہی نہ سکا۔ میں ذہن میں لفظوں کو ترتیب دیتے ہوئے اور اپنے اندر ہمت جمع کرتے ہوئے کاؤنٹر تک گیا۔ بل مانگا مگر... مگر یہ کیا؟ بل تو ادا ہو چکا تھا۔ اور میرا کب سے رکا ہوا سانس بحال ہو گیا۔

میرے دل میں اپنے اعلا ظرف دوست کے لیے عقیدت اور بھی بڑھ گئی جس سے بظاہر میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اور یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ میرا اعلا ظرف دوست اگلی اسٹریٹ میں رہنے والے بے گھر اور بے اماں لوگوں کے لیے روز ہی یہاں سے کھانا پیک کروا کے لے جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں پہلی بار سعد کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا۔ چار منزلہ خوبصورت آف وائٹ "ولا" دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ کیا یہاں بھی پاکستانیوں کے اتنے خوب صورت

ولاز ہیں؟ ولا کی چھت کے شیڈز سمر پنک کلر کے تھے۔

گیٹ سے اندر دور تک ایک چوڑی روش بل کھاتی جارہی تھی۔ جو برج کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ روش کے گرد بنی کیاریوں میں گلاب ڈیفوڈلز ٹیولپ اور وائٹ للی کے پھول خاص ترتیب سے لگے بہار دکھا رہے تھے۔ انتہائی خوب صورت اور وسیع و عریض لان... روش کا اختتام پورٹیکو میں ہوتا تھا۔ پورٹیکو کے ستون سی گرین کلر کے تھے۔ وسیع گیراج اور گیراج میں کھڑی نئے ماڈل کی شیورلیٹ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"واؤ... ارے یار! یہ تمہارا ہی گھر ہے نا؟"

"جی نہیں... یہ میرا نہیں میرے باپ کا گھر ہے۔"

"ایک ہی بات ہوئی تمہارا یا تمہارے باپ کا۔"

"ایک بات کیسے ہوئی؟ یہ میرے باپ کا گھر ہے نا! تو ان ہی کا ہے صرف۔ اس میں میری محنت کی کمائی کا ایک روپیہ بھی شامل نہیں۔ میرا گھر وہ ہوگا جو میں خود اپنی محنت سے بناؤں گا۔" میں اس قدر مبہوت تھا کہ ٹھیک سے سعد کی بات سن ہی نہیں پایا۔

"واؤ... آسم!!" یار تم تو بے حد امیر ہو۔ پھر مفلسوں کی طرح چھوٹے سے فلیٹ میں کیوں رہتے ہو؟

"یہ دیکھنے کے لیے کہ مفلس لوگ زندگی کیسے گزارتے ہیں۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا مگر اس کے چہرے پہ مذاق کا شائبہ تک نہ تھا۔

جب ہم ٹی وی لاؤنج سے ہوتے ہوئے تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اچانک میری نظر شیشے کی طرح چمکتی دو گولیوں پر پڑی۔ پہلے تو یہ گمان ہوا کہ شاید براؤن کلر کا کوئی ڈیکوریشن پیس رکھا ہے۔ مگر جب اس ڈیکوریشن پیس میں تھوڑی سی حرکت ہوئی تب مجھے اپنی حرکت قلب بند ہوتی محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ چمکتی گولیاں بے جان ڈیکوریشن پیس نہیں بلکہ جیتے جاگتے گدھے کے سائز کے بل ڈاگ کی آنکھیں تھیں۔ بل ڈاگ ٹی وی لاؤنج کے براؤن کلر کے قالین، براؤن پردوں اور براؤن فرنیچر کا اس طرح سے حصہ بنا ہوا تھا گویا وہ اور کمرہ لازم ملزوم ہیں۔ اس ٹی وی لاؤنج میں اس بل ڈاگ کا اٹیچ پرسنل روم تھا گویا جب اس کا ٹی وی لاؤنج میں آنے اور ٹی وی دیکھنے کا موڈ ہوتا تو اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

"ارے رے... تم نے اتنی خوف ناک چیزیں بھی رکھی ہوئی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر بندے کا دم ہی نکل جائے؟"

"ایسے شوق مجھے نہیں میرے ڈیڈی کو ہیں۔ انہیں انسانوں سے زیادہ جانوروں سے پیار ہے۔"

سعد مجھے اپنی لائبریری میں لے گیا۔ جس کا فرنیچر صندل کی لکڑی کا تھا۔

"تم جب تک یہاں سے اپنی پسند کی کتابیں چن لو تب تک میں کسی سے کافی کا کہتا ہوں۔ پھر ہم اچھا سا ڈنر کریں گے۔" وہ چلا گیا اور میں کتابیں دیکھنے لگا۔

یہاں تو کتابوں کا جہاں آباد تھا۔ میں نے ایک کتاب اٹھالی۔ یہ لیوٹالسٹائی کی "اینا کرینینا" تھی۔ ساتھ والے خانے میں لینن کی دنیا آباد تھی۔ کہیں شیکسپیئر، سڈنی شیلڈن، شیلے کیٹس براجمان تھے تو وہیں برنارڈ شا، کارل مارکس تو وہیں ٹیگور اور قاضی نذرالسلام بھی تھے۔ فارسی کے شعراء اردو ادب کے قد آور نام اور جانے کون کون تھا جنہیں میں جانتا تک نہ تھا۔ "وار اینڈ پیس" نکال کر میں نے ٹیبل پہ رکھا۔

"رابندرناتھ ٹیگور" کے ہم عصر عظیم بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام کی "بوندولبرا نما کہانی" اٹھائی تو مجھے ان کی نظم وریدو (غیرت) یاد آگئی یہی نظم میرا ان سے تعارف کا باعث بنی تھی نظم کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

اے غربت تو نے مجھے عظیم بنادیا ہے
اے غربت تو نے بمثل مسیح مجھے وقار بخشا ہے
میرا پندار میری چشم عریاں میری زبان تجھ پہ نثار
تیری شدت نے میری دنیا کو تیغ بنادیا ہے

اے میرے بچے، جان پدر
میں تجھے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دے سکتا
تو پھر تجھ سے پیار کرنے کا مجھے حق
غربت میری دہلیز پہ گریہ کناں ہے

میری بیوی' میرے بچے کی طرح
تو اب میں چین کی بانسری کیسے بجاپاؤں گا

میں لفظوں کی دنیا میں کھو سا گیا۔ اتنے میں سعد بھی آگیا۔ کچھ دیر بعد کافی بھی آگئی۔ کافی پینے کے ساتھ ساتھ کتابوں پر تبصرہ بھی کیا جارہا تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد سعد مجھے اپنے اسٹوڈیو لے گیا۔ جس کے ایک حصے میں اس کی ذاتی پینٹنگز آویزاں تھیں' ساتھ ہی تصویر کشی سے متعلق سامان' برش' کینوس' کلرز وغیرہ ترتیب سے رکھے تھے۔ دوسرے حصے میں بڑے بڑے مصوروں کی پینٹنگز آویزاں تھیں' ایک نظر میں تو مجھے ساری پینٹنگز فضول لگیں۔ میری توجہ تو صرف ایک پینٹنگ نے اپنی جانب مبذول کروائی۔

اس پینٹنگ کا سائز بہت چھوٹا تھا۔ بس یہی کوئی نو انچ کے قریب لمبی اور تقریباً" آٹھ انچ چوڑی اس میں ایک بوڑھے شخص کا چہرہ دکھایا تھا۔ جس کے آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اور چہرے پر درماندگی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

سعد نے مجھے بتایا کہ اس پینٹنگ کا نام "ربی" ہے اور اس کے آرٹسٹ کا نام ریمبراں ہے۔ دیکھنے میں یہ پینٹنگ چھوٹی سی ہے مگر آرٹ کے قدر دانوں کے نزدیک اس کی موجودہ قیمت کم از کم بھی دس لاکھ ڈالر ہے۔ اور میں حیرت سے مرنے والا ہو گیا۔

"جب میں نے اے لیول میں ٹاپ کیا تھا تب ڈیڈی نے یہ پینٹنگ مجھے گفٹ کی تھی۔ اس وقت اس کی قیمت چار لاکھ ڈالر تھی۔"

"واہ بھئی۔۔۔ تم امیر لوگوں کے بھی کیا کہنے۔" گو کہ مجھے آرٹ سے بالکل بھی لگاؤ نہیں تھا' مگر ان پینٹنگز کی قیمتیں سن کر میں ان میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ سعد مجھے "ریمبراں" کی "کرائسٹ آن کراس" اور "برگوماسٹر ھکس" کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے پاس "پابلو پکاسو' بروزنیو' ویر میز' پیپن' بیلو' لیوس نبیوئل اور فرانسکو زبران جیسے نامور مصوروں کی آرٹ کلیکشن تھی۔"

"یہ سلواڈور ڈالی کی پینٹنگ ہے۔ جس نے کھاتے ہوئے پنیر سے متاثر ہو کر اس لینڈ اسکیپ پر پگھلتی ہوئی گھڑیاں بنا ڈالی تھیں۔"

"پگھلتی ہوئی گھڑیاں۔۔۔؟ سنا تھا مگر آج دیکھ بھی لیا کہ آرٹسٹ پاگل ہوتے ہیں۔" ان عجیب و غریب پینٹنگز کو دیکھ کر میں جو اپنی ہنسی دبائے ہوئے تھا اب اپنے قہقہے کو روک نہیں پایا۔

"یہ پاگلوں والا مقولہ تو رائٹروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور ان پر فٹ بھی آتا ہے۔" وہ کب سے مجھے منہ بناتے دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے بدلہ چکا دیا۔

"اچھا یہ حسینہ کون ہے؟"

"لیونارڈو ڈونچی کی مونالیزا کی کاپی ہے جسے ایک مشہور آرٹسٹ نے بنایا ہے۔" سعد نے یوں فخر سے بتایا گویا یہ کارنامہ اسی کا ہو۔

"تو یہ ہے مونالیزا؟ میں نے اس کے حسن اور مسکراہٹ کے بڑے چرچے سنے تھے۔ یہ تو لگتا ہے جیسے زبردستی گدگدی کر کے اسے ہنسایا جا رہا ہو اور یہ اس نے اپنی گال میں کیا دبا رکھا ہے؟"

"بہت ہی بد ذوق ہو تم تو۔ چلو اب نکلو یہاں سے' اب میں مزید اتنے عظیم مصوروں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ نکل لو پتلی گلی سے' کہیں مارے ہی نہ جاؤ میرے ہاتھوں سے۔" اس نے مجھے مکا جڑ دیا۔

"او کے یار جسٹ کڈنگ۔۔۔ او ہاں' یاد آیا۔ تم نے مجھے ڈنر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں جانتا ہوں تم بہت پیٹو ہو' چلو کھانا لگ چکا ہو گا۔"

کھانے کی میز پر سعد کے والد پہلے سے موجود تھے۔

"اوہو' آیئے آیئے۔۔۔ آج صاحبزادے گھر پر کیسے نظر آرہے ہیں؟"

"السلام علیکم!" میں نے انہیں سلام کیا مگر سعد نے تو یہ تکلف بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی ان کی بات کا جواب دینا ضروری خیال کیا۔ میرے سلام کے جواب میں ان کی گھنی بھنوؤں کے درمیان لکیریں کھنچ گئیں۔

انہوں نے میرے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"پتا نہیں تم کن کن کنگلوں فقیروں کو اٹھا کے گھر لے آتے ہو۔" ان کے لہجے میں انتہائی حقارت اور نفرت تھی۔ میں شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا۔

"ڈیڈی۔۔ یہ میرا دوست ہے۔" سعد احتجاجاً" بولا۔

"اونہہ دوست ۔۔۔ ان ہی جیسے دوستوں نے تمہارا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ ایسے لفنگوں کی وجہ سے تم اپنا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہو۔ دیکھنا! بہت پچھتاؤ گے ایک دن۔۔

دیکھو۔۔۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہارے مستقبل کے لیے ہی تمہیں مشورے دیتا ہوں۔ مان جاؤ اور بزنس میں انٹرسٹ لو۔" اب کے وہ قدرے رک کر نرمی سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے مشوروں کی۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں آرٹسٹ بننا چاہتا ہوں۔" سعد کے نقوش بھی بگڑے۔

"ھونہہ آرٹسٹ ۔۔۔ یہ بھی کوئی پروفیشن ہے؟ فارغ اور نکمے لوگوں کے کام ہیں یہ۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار میز پر پٹکا اور وہاں سے چلے گئے۔

"آئی ایم سوری یار۔" دکھ سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کوئی بات نہیں میں نے تو بالکل بھی مائنڈ نہیں کیا۔ ویسے بھی میں تو اس سے بھی شدید نفرتیں سہنے کا عادی ہوں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔" ہم کھانا کھائے بغیر ہی فلیٹ واپس آ گئے۔

☼ ☼ ☼

سعد کی مما مقامی لارڈ "ولیم جیف" کی بیٹی تھی اور والد پاکستانی تھے۔ دونوں کلاس فیلو تھے۔ دوستی رفتہ رفتہ محبت میں بدل گئی۔ سعد کی مما خاندانی کیتھولک تھیں لیکن اسلام کی حقانیت سے شروع سے ہی متاثر تھیں۔ اور پھر آخر وہ دن آگیا جب انہوں نے شب کی تاریکیوں سے نکل کر اجالوں میں قدم رکھا۔ ان کا اسلامی نام زینب رکھا گیا۔ سعد کے نانا اعلا ظرف انسان تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کے اس فیصلے کو کھلے دل سے تسلیم کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود بھی اسلام سے متاثر تھے۔ سعد کی نانی ایک ترکش خاتون تھیں۔ رحمان حجازی ہر لمحہ دو کو چار بنانے کی فکر میں رہنے والے انسان تھے۔

شادی کے تیسرے سال سعد پیدا ہوا۔ بیٹی کی شادی کے بعد لارڈ "ولیم جیف" نے ساری بزنس ایمپائر بیٹی اور داماد کے حوالے کر دی۔ اس دوران رحمان حجازی نے بھرپور محنت سے خود کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا تھا۔ رحمان حجازی بھی ان کے محل نما گھر شفٹ ہو گئے۔ بظاہر دونوں میاں بیوی مل کر بزنس چلا رہے تھے۔ زینب خاتون اپنے شوہر پر اپنے آپ سے بھی زیادہ اعتبار کرتی تھیں۔ وہ لارڈ صاحب مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مشرقی لوگ ہمیشہ بے ریا اور صاف دل کے مالک ہوتے ہیں دوسروں کے اعتبار و اعتماد اور جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن دونوں بھول گئے تھے کہ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

رحمان حجازی نے زینب خاتون کے اعتماد کا فائدہ یوں اٹھایا کہ نامحسوس انداز میں انہیں بزنس سے دور کرتے گئے اور جانے کب سارا بزنس و جائیداد اپنے نام کروا لیا اور جب زینب خاتون پہ اس دھوکے کا انکشاف ہوا تو وہ اپنے اعتماد و محبت کا خون ہوتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں اور زبردست ہارٹ اٹیک کے بعد خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اس وقت سعد چھ سال کا تھا۔

لارڈ صاحب بیٹی کی وفات کے بعد ڈھے سے گئے۔ وہ چاہتے تو رحمان حجازی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتے لیکن سعد کی محبت میں انہیں یہ سب گوارا نہ ہوا کہ سعد ماں کے بعد باپ کی محبت کو بھی ترسے۔ رحمان حجازی دھوکے باز سہی مگر اولاد کے معاملے میں اتنے سفاک نہیں ہو سکتے اور بیٹے کی محبت کے آگے تو انہوں نے واقعی گھٹنے ٹیک دیے۔

لارڈ صاحب دل و جان سے سعد کی پرورش میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے سعد کی پرورش خالص

مشرقی انداز میں کی۔ انہیں نہ صرف اردو زبان پہ عبور حاصل تھا بلکہ پاکستان کی علاقائی زبانوں سے بھی واقفیت تھی۔ جیسے جیسے سعد شعور کی حدوں میں داخل ہوتا گیا اس کے اپنے والد سے اختلافات بڑھتے گئے۔ بہت کچھ وہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سمجھ گیا تھا۔ لارڈ صاحب کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ پاکستان میں اس کا ددھیال خاصا بھرا پُرا تھا۔ اتنے سارے اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی میں یہاں بالکل تنہا تھا۔ پاکستان اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

اپنے وطن اور ہم وطنوں کی محبت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے ڈیڈی کو کئی بار قائل کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ وہ اپنا بزنس پاکستان منتقل کرلیں لیکن وہ مان کے ہی نہ دیے' بقول ان کے "پاکستان میں سوائے دھول مٹی' دہشت گردی اور لوٹ مار کے رکھا کیا ہے؟" ان ہی اختلافات کے باعث وہ اپنے ڈیڈی سے الگ اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ اسے اپنے زور بازو پہ پورا بھروسہ تھا۔ اسٹڈی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب کرتا اور یوں اپنے اخراجات پورا کرتا۔

☼ ☼ ☼

"تم بزنس کیوں نہیں کرلیتے؟" ایک دن سعد کو بیٹھے بیٹھے جانے کیا سوجھی کہ مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

"میں اور بزنس؟" میں نے حیرت سے سعد کو دیکھا۔

"ہاں تم۔"

"کیوں مذاق کررہے ہو' یار! میں بزنس کیسے کرسکتا ہوں؟ نہ میرے پاس سرمایہ اور نہ ہی صلاحیتیں اور سوجھ بوجھ اور پھر میں اپنے ادھورے وجود کے ساتھ کیا کرسکتا ہوں؟"

"جسٹ شٹ اپ۔۔۔ تم اپنے دماغ سے یہ خناس نکال نہیں سکتے؟ ان فیکٹ تم بہت سے مکمل لوگوں سے ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ ہر انسان مکمل ہوتا بھی کب ہے؟ کوئی نہ کوئی خامی تو ہر انسان میں ہوتی ہی ہے۔ سو اپنی خامیوں کو بیٹھ کر گنتے رہنے سے بہتر ہے ان خامیوں کو نظر انداز کرکے اپنی چھپی ہوئی خوبیوں کو استعمال میں لایا جائے۔ اور رہی بات صلاحیت یا قابلیت کی تو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ تم بلاشبہ انتہائی جینئس ہو۔ بس تھوڑی سی ہمت کرنی پڑے گی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اتنا سرمایہ آئے گا کہاں سے؟"

"وہ میں تمہیں دوں گا۔" سعد کے لیے گویا کوئی مسئلہ' مسئلہ ہی نہ تھا۔ اس نے چٹکی بجاتے ہی حل پیش کیا۔

"لیکن تم کہاں سے دو گے؟"

"وہ میرا پرابلم ہے تمہارا نہیں۔ سمجھے۔۔۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں "ربی" سیل کردوں گا۔ اس سے جو سرمایہ ملے گا اس سے تم ایک اچھا سا بزنس اسٹارٹ کرسکتے ہو' بلکہ ہم دونوں' سرمایہ میرا محنت تمہاری کیسا؟

"بہت برا۔۔۔ آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ جو نہ تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ بزنس کامیاب ہی ہوگا اور پھر ہم کون سا بزنس اسٹارٹ کریں گے؟ سوری بھئی مجھے تو کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ کھڑے کردیے۔

"ایک تو تم نے سوچ لیا ہے کہ تم نے کبھی بھی کچھ اچھا نہیں سوچنا۔ بلندی تک پہنچنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے نا۔۔۔ اور بزنس کون سا ہوگا' یہ میں تمہیں بتاؤں گا اور گارنٹی بھی میں دوں گا تمہیں۔"

"ارے بھئی' سرمایہ تمہارا۔۔۔ آئیڈیا تمہارا۔۔۔ گارنٹیاں تمہاری۔۔۔ تو پھر مجھے کیوں بیچ میں گھسیٹ رہے ہو' بزنس بھی تم ہی کرو۔"

"ارے بھولے بادشاہ! بزنس ہی کرنا ہوتا تو ڈیڈی کا کہا نہ مان لیتا' خوامخواہ میں ناخلف و نافرمان ہوا پھرتا ہوں۔ مجھ سے حساب کتاب نہیں ہوتے۔"

"لیکن یار! "ربی" تو تمہارے ڈیڈی نے تمہیں

گفٹ دیا تھا۔ وہ کیوں سیل کرو گے تم؟ اور پھر تمہیں وہ پسند بھی ہے اور تمہارے ڈیڈی مان جائیں گے؟" میں پس و پیش کر رہا تھا۔

"کہا نا' ساری پرابلم میری ہے۔ تم بس تیاری پکڑو۔"

"لیکن۔۔۔"

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ اس لیکن کو اپنی زندگی سے نکال دو اور آگے بڑھ کے اپنے حصے کی خوشیاں زمانے سے چھین لو میرے دوست۔" وہ چلا گیا اور میرے لیے سوچوں کے نئے در وا کر گیا۔

اور پھر انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں ضرور چھینوں گا۔ آخر زندگی مجھے موقع دے رہی ہے تو میں فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔

☼ ☼ ☼

کامیابی کا پھل ہمیشہ محنت کے درخت پہ ہی لگتا ہے۔ سعد کا سرمایہ تھا اور میری محنت' دن رات کی محنت کی بدولت میں بلندی کی سیڑھی پہ سیڑھی چڑھتا گیا اور کچھ قسمت نے یاوری کی کہ میں آج ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ درمیان میں کیسی کیسی رکاوٹیں آئیں۔ کتنی پریشانیاں آئیں۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ہر کامیاب آدمی بہت سی رکاوٹیں عبور کر کے کامیاب کہلاتا ہے۔ کامیاب ہونا آسان نہیں ہوتا۔ ساری آسانیاں قربان کرنی پڑتی ہیں۔ جیسے ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے اسی طرح ہر مشکل میں میری دوڑ سعد تک ہوتی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ سعد کا سارا سرمایہ اُسے لوٹا دیا۔ اب اس بزنس کا میں بلا شرکت غیرے مالک تھا۔

میں جو کبھی دولت کو خوشیوں کی وجہ سمجھتا تھا' آج جب میں خود بے انتہا دولت کا مالک ہوں تو اس بے مایہ اور بے مول دولت کی حقیقت سمجھ میں آگئی ہے۔ یہ تو بس ایک چمکتا دھوکا ہے۔ ساری زندگی انسان زر کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے' ذلیل و خوار ہوتا ہے اور اپنے آپ کو آخری حد تک گرانے سے بھی باز نہیں آتا۔ مگر جب یہ بے وفا دولت ہاتھ آجاتی ہے تو خبر ہوتی ہے کہ یہ نرا خسارا ہے۔ یہ چمکتی چیز تو نرا اندھیرا ہے۔ نرا عذاب۔ مگر ایک بات ہے۔ یہ اپنے مالک کی بہت عزت کرواتی ہے۔ کہیں ذلیل نہیں ہونے دیتی۔ گناہ گار ہوتے ہوئے بھی گناہ گار نہیں کہلانے دیتی۔

سعد کے اپنے ڈیڈی سے تعلقات بہت بہتر ہو گئے تھے۔ کچھ انہوں نے خود کو بدلا تھا۔ کچھ میرے سمجھانے بجھانے پہ سعد نے خود کو بدلا تھا۔ اس نے اپنے ڈیڈی کا آفس سنبھال لیا تھا اور فری ٹائم میں وہی اس کا پرانا شوق۔۔۔ وہ اور پینٹنگ۔۔۔

اب تو سعد کے ڈیڈی میرے ساتھ بھی بہت شفقت سے پیش آتے۔ اب اللہ جانے وہ میری موجودہ حیثیت کی وجہ سے میری عزت کرتے تھے یا انہوں نے واقعی دوسروں کی عزت کرنا سیکھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پنک ٹریک سوٹ میں وہ گلابی سی گڑیا بلاشبہ وہی تھی۔ اچانک صبح انتہائی خوب صورت دل کش اور پرسکون لگنے لگی۔ وہ اپنی پونی ٹیل جھلاتی تیسری بار میرے قریب سے گزری تو ہر بار کی طرح اس بار بھی میں نے اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی تھی یا پھر شاید مجھے ہی ایسا لگا۔ کافی عرصے سے یہی روٹین تھی۔ میں اور سعد صبح جاگنگ کے لیے اس پارک میں آتے اور یوں ہماری ملاقاتیں رہتی تھیں۔ فجر کی نماز تو عرصہ ہوا چھوٹ چکی تھی۔ لیکن جاگنگ ضروری ہوتی تھی۔

آج سعد نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی ہو یا نہ مگر میں اسے دیکھ کر ضرور چونک گیا تھا۔ بلاشبہ وہ میرے لیے اجنبی تھی مگر ایک اپنائیت کا سا احساس مجھے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ ہوتا ہے نا۔ یوں ہی کسی کو دیکھ کر اپنے ہونے کا احساس۔۔۔ ان آنکھوں میں جانے کیسا سحر ہے؟ کیسا جادو ہے۔۔۔ وہ جو میں سالوں سے کسی اور کی آنکھوں کے سحر میں گرفتار تھا' چاہتے

ہوئے بھی ان آنکھوں کے سحر سے خود کو نہ بچا سکا مگر اب اچانک ان دو نینوں نے مجھے ان آنکھوں کے سحر سے آزاد کر کے اپنے سحر میں جکڑ لیا اور میں نے جو سالوں سے اپنے دل کو تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ وہ جانے کیوں ہمک ہمک کر ان نشیلے نینوں کی چاہ کرنے لگا۔

دوسرے روز میں لاشعوری طور پر جلد ہی پارک پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں بینچ پہ بیٹھ کے اس کا انتظار کرنے لگا۔ سبز نینوں کا ارتکاز محسوس کر کے میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے شاید ہیلو۔ کہا تھا۔ ایک مسکراہٹ میری جانب اچھال کر وہ جا چکی تھی۔ میں گڑبڑا گیا مجھے اپنی سماعت کا دھوکا محسوس ہوا۔ وہ تو چلی گئی تھی مگر اپنی خوشبو اور آنکھیں میرے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔

راہ چلتے ہوئے اکثر یہ گماں ہوتا ہے
وہ نظر چھپ کے مجھے دیکھ رہی ہو جیسے
کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے آنکھوں سے کوئی بات کہی ہو جیسے

میں گنگنانے لگا۔

وہ بازگشت دن بھر میرا پیچھا کرتی رہی۔

"ہیلو۔۔۔" رات کو بستر پر لیٹا تو پھر سے وہ لمحہ نظروں کے سامنے آن ٹھہرا۔ یوں لگا میرے ارد گرد جھرنے سے بہنے لگے ہوں۔ اتنی مدھم اور شائستہ آواز۔۔۔ میں جو ان آنکھوں کے سحر میں گرفتار تھا اب اس آواز کے فسوں میں جکڑنے لگا۔ ایک عجیب سا احساس دن بھر ستاتا رہا یوں جیسے میں کسی کی نظروں کے حصار میں ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل میں اس سے ضرور بات کروں گا۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ یہاں سونے کے لیے آتے ہیں؟"

میں بینچ پر آج پھر اپنے ہی خیالوں میں بیٹھا تھا۔ اور آج پھر ذرا جلدی پارک آ گیا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس آواز پہ چونک گیا۔ وہ شرارت بھری نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"جی نہیں میں واک کرنے آتا ہوں۔"

"مگر میں تو دو دنوں سے آپ کو یونہی مراقبہ کرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ آپ رائٹر ہیں نا۔۔؟"

ارے! یہ تو سچ مچ کی ساحرہ ہی ہے۔ "جی کبھی کبھار لکھتا ہوں لیکن پروفیشنل رائٹر نہیں ہوں مگر آپ کیسے جانتی ہیں؟"

"آپ کے مراقبہ کرنے کے انداز سے۔" میں کھسیا گیا۔

"مجھے سب پیار سے ہادی بلاتے ہیں۔"

"اور مجھے "انس علی خان" کہتے ہیں۔"

"کہیں آپ وہی انس علی خان تو نہیں جو ایک انٹرنیشنل نیوز پیپر میں آرٹیکلز لکھتے ہیں۔" اس کی جھیل سی آنکھوں میں استعجاب تھا۔

"جی آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔"

"ارے! آپ کے آرٹیکلز تو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور آپ کا ناول بھی میں نے پڑھا ہے اور میری مما بھی آپ کو شوق سے پڑھتی ہیں۔ آپ کا ناول بہت زبردست تھا۔ لیکن اس کے بعد آپ کا کوئی اور ناول یا کچھ بھی پڑھنے کو نہیں ملا۔"

ارے 'یہ لڑکی تو اپنی فین ہی نکلی۔ مجھے خوش گوار سی حیرت نے گھیر لیا۔ سب کچھ کسی کہانی کے جیسا لگ رہا تھا۔

"بس وقت کی کمی کے باعث اس طرف توجہ ہی نہیں دے پایا۔" میں نے گھسا پٹا بہانہ بنایا۔

"ارے وقت تو الاسٹک کی طرح ہوتا ہے جتنا کھینچیں گے اتنا ہی نکلے گا۔ آپ کے فینز آپ کی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ کم از کم اپنے فینز کے لیے آپ تھوڑا سا وقت تو نکال ہی سکتے ہیں نا!"

"جی ان شاء اللہ کچھ نیا ضرور لکھوں گا۔" دل اس کی فرمائش پہ بلیوں اچھلا تھا۔

"وعدہ۔!" ان آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

"جی جی 'وعدہ۔"

"پکا والا وعدہ؟"

"جی بالکل پکا وعدہ۔" میں اس اپنائیت پہ کھل سا اٹھا۔

تو ہم اجنبی نہیں تھے۔ یک طرفہ ہی سہی آشنائی تو تھی اب اس آشنائی کو دو طرفہ ہونے میں کتنی دیر لگتی؟

"یہ میری مما کی طرف سے۔" پاس ہی کیاری سے سفید گلاب توڑ کے میری جانب بڑھایا۔

"تھینکس۔" میں بس اتنا ہی کہہ پایا۔

"میں مما کو آپ کے بارے میں بتاؤں گی تو وہ بہت خوش ہوں گی۔ وہ آپ کی بہت بڑی فین ہیں۔"

"میری طرف سے انہیں تھینکس کہیے گا۔"

"سنیے۔۔!" میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اس پکار پہ رک گیا۔ ایک پل کو میرا دل مٹھی میں آگیا' مجھے لگا شاید وہ میرے ادھورے وجود پہ ترس کھائے گی۔

میرا دل چاہا وقت یہیں تھم جائے۔ میں کبھی پلٹ کر ان آنکھوں میں اپنے لیے ترحم اور ہمدردی نہ دیکھ سکوں مگر وقت بھلا کب کسی کے لیے تھما ہے۔ مجھے پلٹ کر دیکھنا ہی پڑا۔

"یہ میری طرف سے۔" اس نے ایک اور سفید گلاب میری طرف بڑھایا۔ اب کے میں تھینکس بھی نہ کہہ سکا۔ ایک سرشاری سی دل میں اتر کر ایک نیا اعتماد بخش گئی۔ میں بیساکھی ٹیکتا چل دیا۔ میں جو اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا' یوں اس سے آشنائی ہو جائے گی میں نے سوچا نہ تھا۔

"یا ہو۔۔" اس کی پہنچ سے دور ہوتے ہی میں نے نعرہ لگایا۔ شاید قدرت کو یوں ہی منظور ہو گا۔ آج کا دن بہت خوب صورت گزرنے والا تھا اور شاید آنے والے دن بھی۔۔۔



"ہیلو۔۔!" مسٹر جونز نے مسکرا کے کہا۔

"ہیلو۔۔ خیریت؟ بہت دنوں بعد نظر آ رہے ہیں؟" مسٹر جونز بھی مستقل واک کے عادی تھے۔

"بس میری طبیعت خراب تھی۔" میں نے رک کر ان کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں سعد ہانپتا کانپتا بھاگتا ہوا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ہاتھ ہلایا اور پاس آ کے بریک لگا دی۔

"خیریت جناب! آج آپ کی صبح اتنی جلدی ہو گئی؟"

"ہائے۔۔ کیا بتاؤں ہائے ہائے۔" اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ پاس پڑے بینچ پہ بیٹھ کے اپنا سانس درست کرنے لگا۔

"اب بتا بھی چکو۔ اگر ہائے ہائے کرتے رہے تو۔۔ جب تک تم نارمل ہو گے تب تک کھڑے کھڑے میرا سانس پھول جائے گا۔"

"تو کس نے کہا ہے کھڑا ہونے کو۔۔؟" میں آگے بڑھ کے بینچ پہ بیٹھ گیا۔

"اپنی درد بھری داستان کہاں سے شروع کروں میرے دوست؟ اس درد بھری کہانی کو سن کر تم آٹھ آٹھ آنسو روؤ گے۔"

"بے فکر رہو' میں نہیں رونے والا۔ جلدی سے اپنی درد بھری کہانی سناؤ پھر میں اس کہانی پہ کہانی لکھوں گا۔ ابھی کل ہی ایک پری نے مجھ سے کہانی لکھنے کی فرمائش کی ہے۔"

"کیا بات ہے تمہاری۔۔ کہانی پہ کہانی لکھو گے اور یہ پری کا کیا چکر ہے ڈیئر؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"کیوں تم سے مطلب؟"

"اچھا اچھا' سمجھ گیا خواب میں دیکھی ہو گی ورنہ یہاں تو گوری چمڑی والے پھیکے شلجم ہی نظر آتے ہیں۔" اس نے پاس سے گزرتی دو گوری لڑکیوں کو دیکھ کر آہ بھری۔

"تم اپنی داستان سنانے والے تھے' وہ بھی دکھ بھری۔"

"ہائے۔۔ کیا یاد کروا دیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں خواب میں پریاں نظر آتی ہیں۔ مگر مجھے تو ایک چڑیل چمٹ گئی ہے۔ نہ دن کو چین لینے دیتی ہے' ہر وقت کہیں نہ کہیں بھگائے رکھتی ہے اور تو اور راتوں کو بھی خواب میں آ کر ڈراتی رہتی ہے۔ چڑیل صاحبہ

خود تو اتنی ٹھٹھرتی سردی میں واک کرنے کی شوقین ہیں ہی مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لیتی ہے۔ لو وہ صاحبہ خود ہی آگئیں۔"

میں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو "وہ" روش پہ تیز چلتی آرہی تھی۔

"ایں! یہ تو وہ پری..." میں نے جلدی سے اپنی پھسلنے والی زبان دانتوں تلے دبالی۔ مگر سعد کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتا وہ قریب آگئی۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام میں پہل کی۔

"وعلیکم السلام۔" مشترکہ جواب دیا گیا۔

"کیسے ہیں آپ...؟" سوال کا نشانہ میں تھا اور سعد تو حیرت سے منہ کھول کر دیکھنے لگا۔

"فرسٹ کلاس... آپ کیسی ہیں؟"

"تو گویا آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟" سعد کو بھی ہوش آیا جو بدھوؤں کی طرح کبھی مجھے اور کبھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"اتنا زیادہ بھی نہیں جانتے۔ یہ ریگولر واک کرنے آتی ہیں اور میں بھی اس لیے بس ہائے ہیلو۔" میں نے جلدی سے وضاحت دی۔ اور سوالیہ انداز سے سعد کو دیکھا۔

"یہ ہادی ہے... یہ تو پتا ہی ہوگا آپ کو؟ یہ میری کزن ہیں۔ اس کی ماما' پاپا کی فرسٹ کزن ہیں۔ اور ہائر اسٹڈی کے لیے یہاں آئی ہیں۔" سعد نے اس کا تعارف کروایا۔ "اور ہادی یہ میرے بہت اچھے اور بہت پیارے دوست "انس علی خان" ہیں۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ بہت اچھے ہیں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ بہت بڑے رائٹر بھی ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ اتنے ڈیسنٹ اور نائس انسان' تمہارے جیسے چغد کے دوست بھی ہیں۔"

"لو جی' آپ محترمہ مجھے چغد کہہ رہی ہیں۔ ان ڈیسنٹ اور نائس بندے سے پوچھ لیجیے کہ ابھی میں آپ کی کتنی تعریفیں کر رہا تھا کہ "میری پیاری سی کزن مجھے بالکل بھی تنگ نہیں کرتی نہ ہی لائبریری کے چکر لگواتی ہے۔ نہ ہی خوابوں میں بھوت بن کر ڈراتی ہے اور نہ ہی صبح صبح گرم بستر سے اٹھا کر اتنی سردی میں واک کرنے کی فرمائش کرتی ہے۔"

"توبہ! تم سے تو اللہ سمجھے۔ اب میں بھی انہیں نہیں بتاؤں گی کہ تم شیطان کے چیلے ہو اور میری ناک میں دم تو بالکل بھی نہیں کرتے۔ اور نہ ہی وقت بے وقت مجھ سے پراٹھے بنوانے کی فرمائش کرتے ہو۔" اس کے اس انداز پہ میں کھل کے ہنس دیا۔

"اب چلو سعد کے بچے... مجھے یونی بھی جانا ہے۔"

"ہاں بھئی چلو... مجھے کون سا شوق ہے سردی میں ٹھٹھرنے کا۔" سعد فوراً" کھڑا ہوا۔

"اب تو روز ہی آپ سے ملاقات رہا کرے گی۔" اب کے اس کا مخاطب میں تھا۔

"جی بالکل۔" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"ہاں یاد آیا..." وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"آپ نے کچھ نیا لکھا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں لکھا۔"

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

"ان شاء اللہ میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔ مگر اتنے عرصے بعد کچھ لکھنے میں مشکل تو ہوگی نا؟" میں نے چور نظروں سے سعد کو دیکھا جو معنی خیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اوکے... مگر لکھیے گا ضرور اور کوئی آپ کو پڑھے نہ پڑھے مگر میں آپ کے لفظ پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"اوکے' اللہ حافظ۔" اس نے کہا۔

"اللہ حافظ۔" میں نے زیر لب کہا۔

جب وہ چل دی تو سعد نے ہاتھ منہ پھیر کر مجھے انگلی دکھائی گویا اشارہ تھا کہ تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا بچو۔ "اب جو سعد کے ہاتھوں میری درگت بنتی وہ الامان۔

☼ ☼ ☼

پچھلے پورے ایک گھنٹے سے سعد میرا دماغ چاٹ رہا

تھا۔

"یار ایسا کچھ نہیں ہے۔ جیسا تم سمجھ رہے ہو۔"

"تو پھر کیسا ہے۔؟"

"کیسا بھی نہیں۔"

"تم دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن کان کھول کر سن لو میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"کیوں مذاق کر رہے ہو؟ جو چیز آل ریڈی 'ریڈی میڈ' ہو اسے مزید کیسے بنایا جا سکتا ہے۔"

"یہ آنکھوں میں چمک۔۔۔ چہرے پہ رونق اور دل و دماغ میں خوش کن خیالات ایسے ہی تو نہیں ہیں؟ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی اور مجھے لگتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"

میں نے چونک کر سعد کو دیکھا اور اس نے میرا چونکنا پکڑ لیا۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کچھ نہ کچھ ہے۔ جب ہی تو اس بات پہ تمہارے بے سرے منہ پہ ایک دم کیسی رونق آئی ہے۔ یہ ہونٹ بات بے بات یونہی نہیں مسکرا اٹھے۔ پہلے تو ہم اتنے خوش اخلاق نہیں تھے۔"

"میں پہلے بھی ایسا ہی خوش اخلاق و خوش مزاج تھا۔ بس تم نے غور اب کیا ہے اور اب میری جان چھوڑو اللہ کے بندے۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں ابھی۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تم کام کا بہانہ نہ بنا کر مجھے ٹال نہیں سکتے۔ میں تم سے سچ اگلوا کر ہی رہوں گا۔"

"اچھا۔۔۔ تم مجھے بتا ہی دو کہ تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتے ہو اور میں تمہیں وہ سنا کر جان چھڑاؤں اپنی۔"

"یہی کہ تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے اور تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ یار! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کتنا مزہ آئے گا۔ تمہاری شادی میں بینڈ باجے کے ساتھ تمہیں گھوڑی پہ بٹھا کے، ہم باراتی بن کے جائیں گے اور۔۔۔ اور۔۔۔"

"اور دھڑام سے بیڈ سے نیچے گر جائیں گے اور آنکھ کھل جائے گی۔"

"کتنے ظالم ہو تم۔ تم سے مجھ معصوم کی اتنی سی خوشی بھی نہیں دیکھی جاتی۔"

"سوچتے ہیں تمہاری خوشی کے بارے میں بھی۔۔۔ اور اب اپنی معصوم شکل لے کر نو دو گیارہ ہو جاؤ۔" میں نے اس سے جان چھڑائی۔

"ہرّے۔ آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔" سعد نے نعرہ لگایا۔

"پٹو گے تم مجھ سے۔"

"تمہاری خوشی کے لیے پٹنا بھی منظور۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

میں آفس میں بہت مصروف تھا۔ "ویلز" سے ڈیلی گیشن آیا ہوا تھا۔ بہت بڑی ڈیل ہوئی تھی۔ انہیں سی آف کرنے کے بعد میں ضروری کام نمٹا رہا تھا کہ سیکریٹری نے کارڈلیس پہ کسی خاتون کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے انہیں اندر بھیجنے کو کہا۔

"مے آئی کم ان۔۔۔!" دھیمی اور وہی مسحور کن آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا اور خوش گوار حیرت میں ڈوب گیا۔

"ارے آپ۔۔۔ پلیز آیئے آیئے۔ آپ یہاں کیسے؟" میں بوکھلا گیا۔

"کیوں کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟"

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔" بوکھلاہٹ میں بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔

"لازم تو نہیں کہ جو پہلے نہ ہوا ہو، وہ کبھی بھی نہ ہو۔"

"جی ہاں یہ تو ہے۔" میں نے احمقانہ پن سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"پلیز تشریف رکھیں۔" مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

"میرے خیال میں، میں تو تشریف رکھے ہوئے ہی

ہوں' ہاں البتہ آپ ضرور تشریف رکھئے آپ کا اپنا آفس ہے۔" اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ اور میں شرمندہ ہو گیا۔

"احمق' چغد۔ کیا ہو گیا ہے بھئی۔ ٹین ایجرز والی حرکتیں کیوں شروع کر دیں؟ کیا پہلی بار کسی حسین لڑکی سے ملے ہو؟" میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔

"کیا لیں گی آپ۔ گرم یا ٹھنڈا؟" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بلیک کافی منگوائیں۔" میں نے کارڈلیس کا بٹن دبا کے سیکریٹری کو گرما گرم بلیک کافی اور ریفریشمنٹ کا سامان اندر بھیجنے کا آرڈر دیا۔

"ویسے کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟" میں نے بات کا آغاز کرنے کے لیے یونہی فضول سا سوال کیا۔

"لائبریری آئی تھی۔ مجھے اپنا تھیسس کمپلیٹ کرنے کے لیے کچھ بکس چاہیے تھیں۔ سوچا آپ سے بھی ملاقات ہو جائے۔"

"گڈ۔ اچھا کیا آپ نے جو میرے آفس کو بھی رونق بخش دی۔ کیسی جا رہی ہیں آپ کی کلاسز؟"

"اے ون۔ میں تو اپنی اسٹوڈنٹ لائف کو بہت زیادہ انجوائے کرتی ہوں ویسے بھی یہاں کی اسٹڈی ہمارے ہاں کی اسٹڈی سے بہت ڈیفرنٹ ہے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔

"او کے۔ میری بیسٹ وشز آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کرے آپ یوں ہی قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہیں اور اک دن ایسا آئے کہ دنیا آپ کے قدموں کے نیچے ہو۔" میں نے اسے دل سے دعا دی۔

"لیکن میں دنیا کے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔ آپ کی طرح دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے تن تنہا آگے بڑھتے رہنے سے دنیا والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جبکہ زندہ رہنے کے لیے دنیا والوں کا ساتھ ناگزیر ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اور ہاں۔ کیا صرف آپ کی بیسٹ وشز ہی میرے ساتھ ہیں؟"

"کیا مطلب۔؟" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ کیا آپ کی کوئی اور فیلنگز میرے ساتھ نہیں؟"

میں نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی لو دیتی کانچ سی آنکھیں تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں یا شاید میں ہی غلط سمجھ رہا تھا۔ مس مہتھلڈا کافی کے ساتھ ناشتے کے لوازمات لیے اندر آنے کی اجازت چاہ رہی تھی۔ میں نے سر ہلا کے اجازت دی۔

"گڈ آفٹرنون سر۔" اس نے ناشتے کی ٹرے ٹیبل پہ سجا دی۔

"سیم ٹو یو۔" میں نے رسماً کہا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر خاموشی کا وقفہ رہا۔

"لازم تو نہیں کہ جیسا ہم سوچتے ہیں ویسا ہی دوسرے بھی سوچیں۔" میں نے ویٹ بال کو گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اگر ہماری سوچ اچھی ہو اور دوسروں کو اس

سوچ کو اپنانے میں کوئی حرج یا نقصان بھی نہ ہو' بلکہ فائدہ ہی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم دوسروں کو قائل کرلیں۔"

"ہر کسی کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر ہماری تقدیر۔۔۔ ہماری تقدیر ہماری سوچوں کے تابع نہیں ہوتی۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔ میں اسے کوئی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔

"میں نہیں مانتی اس بات کو۔۔۔ میں تو اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ ہماری خواہشات' ہمارے خوابوں' آرزوؤں اور سوچوں میں پختہ یقین شامل ہو تو یہی یقین ہمیں ہماری منزل تک لے جاتا ہے۔ مانا کہ تقدیر ہماری آرزوؤں کے تابع نہیں ہوتی۔ مگر تقدیر ہماری دعاؤں کے تابع تو ہوتی ہے۔ کامل یقین سے مانگی گئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ دعائیں ہی تو تقدیر بدلنے پہ قادر ہیں۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں' مگر حقیقت بہت کڑوی ہے۔" میں نے سر چیئر کی پشت سے ٹکا دیا۔

"حقیقت جو بھی ہو۔۔۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ سچے اور خالص جذبے کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ میں جانتی ہوں کہ لفظ آپ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ آپ لفظوں سے من چاہا کھیل کھیلتے ہیں۔ کسی بھی بات کو اپنے من چاہے معنی پہنا دیں' مگر دوسروں کے پُرخلوص اور خوب صورت جذبوں کو آپ شک کی عینک سے پرکھ کر غلطی پر ہوں گے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" میں جان کر بھی انجان بن گیا۔

اور اس لمحے میرے دل کو کچھ ہوا۔ میری نظریں اس کی روشن اور پُرامید آنکھوں سے ہوتی ہوئی اپنے ادھورے وجود پہ آکے ٹک گئیں۔ بس یہیں آکے تو میں ہمیشہ ہار جاتا تھا۔ میرے ادھورے وجود نے مجھے کہاں کہاں نہیں ہرایا تھا۔ کہاں کہاں نہیں رلایا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے اپنے ادھورے ہونے کا بہت شدت سے احساس ہوا۔ ورنہ تو میں نے اپنی ذات میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے بہت جتن کیے تھے اور اب تو میں بھول بھی چکا تھا کہ بیساکھی کے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔۔۔ یہی میرا سہارا ہے۔ اسی کے ساتھ میرا وجود مکمل ہوتا ہے۔ یہ میرے دکھ' سکھ اور تنہائی کی ساتھی تھی۔ میں نے اپنے ادھورے وجود کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ نہ صرف جینا بلکہ لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے میں نے منزل تک جانے والا راستہ بھی پکڑ لیا تھا اور اب جبکہ میں بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتے یہاں تک پہنچ گیا تھا تو کانچ جیسی آنکھوں والی دھان پان سی لڑکی نے مجھے میری اوقات یاد دلادی تھی۔

زندگی میں پہلی بار کوئی مجھ سے اظہار محبت کررہا تھا۔ کوئی پہلی بار میرے وجود کو اہمیت دے رہا تھا اور مجھ پہ شادی مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔ نہ خوش ہو سکتا تھا اور نہ ہی۔۔۔ خوش ہوتا بھی کیسے؟ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ میں کیسے خوش ہو سکتا تھا۔ میری خوشیاں بھی میری ذات کی طرح ادھوری تھیں۔

"جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے سنبھل کے کہا۔

"جانتی ہوں۔۔۔ بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں' تب ہی تو ایسا کہہ رہی ہوں۔"

"یہ جاننے کے باوجود بھی کہ میں نامکمل انسان ہوں؟"

"جی ہاں' یہ جاننے کے باوجود بھی۔۔۔" اس کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

"آپ شاید مجھ پہ ترس کھا رہی ہیں؟"

"میں آپ پہ نہیں بلکہ اپنے آپ پہ ترس کھا رہی ہوں۔ بعض لوگ بظاہر مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہوتے ہیں جیسے میں۔۔۔ میں اپنی ذات کی تکمیل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں آپ کے اندر کے پاکردار' مکمل اور خوب صورت انسان سے محبت کرتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں یقین کے دیے جگمگا رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

میں اسے ناامید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ امید کے آخر سرے پر بے یقینی ڈیرہ ڈالے ہوتی ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ بے یقینی کتنی بری چیز ہے۔ اس کا دکھ کتنا گہرا ہوتا ہے۔ آنکھیں بنجر کر دیتا ہے۔ دل کو پتھر کر دیتا ہے۔ باہر کی دنیا میں خواہ کوئی بھی موسم ہو۔ مگر دل کی دنیا میں اک ہی موسم ٹھہر جاتا ہے۔ ہجر کا موسم اور آنکھوں میں برسات کا موسم اور پھر چاہے کچھ بھی کرلو' یہ رت بدلتی ہی نہیں۔ میں ان کانچ سی سبز آنکھوں کو ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتا تھا اور پھر میں نے اچانک فیصلہ کرلیا۔



اور پھر زندگی کا عنوان ہی بدل گیا۔ زندگی بہت خوب صورت ہو گئی اور میں بہت خوش تھا۔ میں پہلی بار زندگی سے اپنے حصے کی مکمل خوشیاں کشید کر رہا تھا اور وہ... اک نازک سی لڑکی... اس کے چہرے پہ بکھرے رنگوں کو میں حیران ہو کے دیکھتا اور سوچتا کہ "کیا محبت انسان کو اتنا خوب صورت بنا دیتی ہے؟"

ہردم سنجیدہ رہنے والی لڑکی بہت شوخ و چنچل ہو گئی تھی۔ سب کچھ جیسے خواب سا تھا اور میں اپنے خوابوں کی دنیا میں رہنے والی اس حسین پری کے دل میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی کو محبت دے رہا تھا' ورنہ تو ہمیشہ میں نے دوسروں سے لیا ہی لیا تھا۔ پہلے چچا' پھر پھپھو... سر عبید اللہ پھر سعد اور اب یہ لڑکی۔ ہر اس موڑ پہ جہاں جہاں میں گرنے لگتا تھا' میرا اللہ کسی نہ کسی کو مجھے تھامنے کے لیے بھیج دیتا تھا اور میں پھر بھی "اللہ" سے اپنی تنہائی کا اپنے ادھورے وجود کا اپنی محرومیوں کا گلہ کرتا رہا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں کس قدر ناشکرا تھا۔

میں ہادی کے لیے ایک ولا لینا چاہتا تھا' مگر وہ تھی کہ... مان کے نہیں دے رہی تھی۔ اس میں بھی سعد کی طرح محب وطن بوڑھی روح گھسی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل... کرنے کے بعد ہر صورت خود بھی پاکستان واپس جائے گی اور مجھے بھی لے جائے گی۔ اسے اپنی محبت کی طاقت پہ بھرپور ناز تھا اور مجھے اپنے آپ پہ بھروسا۔ چلیں دیکھیں گے کہ کون کس کو قائل کرتا ہے؟ کس کی محبت زور آور ہے؟ ایک بار تو پاکستان جانا ہی تھا نا! بھئی ہادی کے والدین سے ملنے۔



لاہور ائیرپورٹ سے نکلے ہی تھے دھیان ذرا سا ادھر ادھر ہوا اور میرا ایک بیگ غائب ہو گیا۔ میں نے خوب واویلا مچایا' مگر ہادی پر ذرا جو اثر ہوا ہو۔ سوچا پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے' لیکن اس سوچ پر عمل در آمد مہنگا پڑ سکتا تھا۔ لینے کے دینے پڑ جاتے تو؟

"الوؤں کی طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہیں؟ ٹیکسی روکیں۔"

"کیا؟" میں اپنے بیگ کا غم غلط کر رہا تھا جس میں ہادی کے گھر والوں کے لیے قیمتی تحائف تھے۔ اس بات پہ چونک اٹھا۔ "ہم ٹیکسی پر جائیں گے؟"

"تو کیا جہاز پہ جائیں گے؟ آپ کی شاہی سواری بہت شان دار ہوتی ہو گی' مگر عالی جناب اس وقت ہمیں ٹیکسی میں ہی جانا ہو گا۔"

میں شرمندہ ہو گیا۔ حالانکہ ہادی نے بتایا تھا کہ اس کے گھر میں اس کی ممی اور فالج کے مریض دادا جان کے سوا کوئی نہیں۔ ٹیکسی میں سوار ہو کے ذرا سا سکھ کا سانس لیا تو اس حسین و رنگین سفر کی اہمیت کا اندازہ ہوا' کیونکہ ہادی میرے ساتھ تھی۔

لیکن میں ذرا سا کنفیوژ تھا کہ کیا پتا ہادی کے گھر والے مجھے پسند بھی کریں گے یا نہیں؟

اس خدشے کا اظہار میں نے ہادی سے بھی کیا تھا۔ تو اس نے انتہائی جذباتی انداز میں آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے خوب بلیک میل کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ٹیکسی تیزی سے منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔ اتنے سالوں میں رستے بدل گئے

تھے۔ نہیں شاید رستے تو وہی تھے' کھیتوں' باغوں اور پارکوں کی جگہ بلند و بالا عمارتوں نے لے لی تھی اور میں مکمل طور پر ہادی کے رحم و کرم پہ تھا۔ سارے پرانے راستے بھول چکے تھے۔ وقت کی دھول میں گم ہو گئے تھے۔ تین' چار گھنٹے کا سفر اونگھتے ہوئے گزرا کیونکہ ہم دونوں ہی تھک چکے تھے۔ ٹیکسی آف وائٹ گیٹ کے سامنے رکی اور اک لمحے کو تو میں کچھ سمجھ ہی نہیں پایا۔ ہم ٹیکسی سے نکلے۔ میں تذبذب میں ہادی کے ساتھ آگے بڑھا۔ جیسے جیسے گیٹ کھلتا گیا۔ یادوں کے دریچے اک اک کر کے وا ہوتے گئے۔

یہ آنگن۔۔۔ آنگن میں بسنے والے لوگ۔۔۔ اور اس آنگن میں نیم کا درخت تو مجھے کبھی بھی نہیں بھولا تھا۔ اس کا اک اک کونا میری یادوں میں بسا تھا۔ یہ نیم کا پیڑ تو میرے ہر اک لمحے کا ساتھی تھا۔



اس شخص کی آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی اور چہرے پر ویرانی سی تھی۔ الجھے ہوئے بال اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں' اس بے بس بوڑھے ولاچار وجود کو دیکھ کر مجھے ریبر اں کا "ربی" یاد آگیا۔ میں نے ادب سے اس انسان کا گھٹنا چھوا' جو دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔

میں نہیں جانتا وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے ہر ممکن زیادتی کی۔ مگر وہ سب تو گزرے وقت کی باتیں تھیں اور وہ گزر گئیں۔ مگر بہرحال اک بات کا اعتراف مجھے ضرور تھا کہ آج میں جس مقام پہ ہوں اسی شخص کی وجہ سے ہوں۔ میری ترقی کے پیچھے اسی شخص کی زیادتیوں کا ہاتھ تھا اور آج وہی کروفر اور رعب داب والا شخص' فالج زدہ زندہ لاش کی طرح بستر پہ پڑا تھا۔ میرے گھٹنے چھونے پہ اس نے اپنا کپکپاتا ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ۔۔۔ اپنے ہاتھ میں لے لیا' سچ ہے کہ مصیبت اور بیماری بڑے سے بڑے انسان کو چت کر دیتی ہے۔

ہادی نے سب کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ اگر نہیں بتایا تھا تو صرف مجھے' حتیٰ کہ سعد بھی اس سارے ڈرامے میں شامل تھا۔ ہادی کا خیال تھا اگر وہ مجھے اندھیرے میں نہ رکھتی تو شاید میں پاکستان کبھی نہ آتا اور میں جو اس بات پہ ششدر تھا کہ اس لڑکی سے اپنائیت کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ تو یہ عقدہ اب کھلا تھا۔

مجھے وہ چھوٹی سی ننھی سی فیری یاد آگئی جو کونوں کھدروں میں شرما کے چھپتی پھرتی تھی۔ جو ذرا سی تیز ہوا پہ ڈر کے مارے رو پڑتی تھی۔ پھوپھا پہ فالج کا شدید حملہ دو سال پہلے ہوا تھا جب انہوں نے اپنے جوان اور اکلوتے بیٹے کو سپرد خاک کیا جو روڈ ایکسیڈنٹ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ شاید جب ہی بیوگی کے دکھ نے بھابھی کو عمر سے پہلے عمر رسیدہ کر دیا تھا۔

اور وہ۔۔۔ عینا۔۔۔ داؤد کے ساتھ بیاہ کر فرانس سدھار گئی تھی۔ آنگن میں خوش گوار تبدیلیاں آگئی تھیں مگر نیم کا درخت وہیں تھا اور اس میں پڑا جھولا غائب تھا۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ذرا سی فرصت ملنے پہ میں نے "ہادی" کا شکریہ ادا کیا کہ جس کی وجہ سے میں اپنوں سے ملا تھا۔ ورنہ تو میں یوں ہی ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔ میری خوشیاں اب مکمل ہو گئی تھیں۔ میری تشنگی سیراب ہو گئی۔ میں خوش تھا بہت خوش۔۔۔

تو ہادی۔۔۔ مطلب نور الہدیٰ۔۔۔ میں جان ہی نہ پایا اور نہ ہی کبھی ہادی کا مکمل نام پوچھا۔ مجھے لگا ہادی ہی اک مکمل نام ہے۔ بہت اچھا وقت گزرا' پتا ہی نہ چلا دن گزرنے کا۔ واپسی کا وقت آن پہنچا۔ مجھے جانا تھا۔ واپس آ کے ہادی کو ہمیشہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔۔۔

